اسلام اور دیگر مذاہب

(اسلام اور دیگر مذاہب کی تعلیم کا موازنہ)

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اسلام اور دیگر مذاہب

پیشتر اس کے کہ میں اس مضمون کو شروع کروں جس پر بولنے کے لئے میں اس وقت کھڑا ہوا ہوں۔ میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں وہ طاقتیں عطا فرمائیں جن کے ذریعہ سے ہم باریک مسائل پر غور کرنے اور فکر کرنے کے قابل ہوئے جن کی وساطت سے ہم اس وراء الورٰی ہستی تک پہنچ سکیں جو تمام موجودات کی خالق اور رازق اور مالک ہے ہاں میں اس شہنشاہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو باوجود اپنی بے انتہاء قدرتوں اور طاقتوں کے باوجود اپنی لاانتہاء پاکیزگی اور طہارت کے کمزور اور ضعیف انسان کی ہدایت کیلئے متوجہ ہؤا اور اسے ایسی طاقتیں اور ایسے علوم عطا فرمائے جن کے ذریعہ سے وہ تمام درمیانی روکوں کو دور کرتے ہوئے اور تمام پردوں کو چاک کرتے ہوئے اپنے آقا کے دربار میں پہنچ سکتا اور اس کے قرب کے مقام کو پا سکتا ہے۔ پھر میں تیسری دفعہ شکریہ ادا کرتا ہوں اس شہنشاہ کا کہ اس نے انسان کی کمزوری دیکھ کر اپنے فضل وکرم سے انسانوں میں سے پاک اور برگزیدہ انسانوں کو چنا تا وہ اس کا شیریں کلام سنیں اور اپنے ایمان کی بنیاد مشاہدہ کی مضبوط چٹان پر رکھیں اور جس نے ان کو ایسے زبردست نشان عطا فرمائے کہ جنہیں دیکھ کر دوسرے لوگ بھی جو صداقت کی تڑپ اپنے اندر رکھتے ہیں اپنے ایمان کو کامل کریں۔ پھر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اس محسن رب کا جس نے ہمیں ایک ایسی حکومت کے ماتحت رکھا ہے کہ جس کی پرامن حکومت میں ہم آزادی سے مذہبی امور میں تبادلہ خیالات کرسکتے ہیں اور بلا خوف وخطر اپنی تحقیقات کو دوسرے بھائیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔

اسلام دنیا کے تمام انبیاءؑ کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے بعد میں آپ لوگوں کی توجہ اس بات کی طرف منعطف کرانی چاہتا ہوں کہ میری غرض اس وقت اسلام اور دیگر مذاہب کا مقابلہ اس رنگ میں کرنا نہیں ہے کہ میں مختلف مذاہب پر کچھ الزامات لگا کر بتاؤں کہ وہ تمام مذاہب باطل ہیں اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہے کیونکہ اگر میں ایسا کروں تو نہ صرف یہ کہ عقل انسانی میرے اس خیال کو بڑے زور سے رد کرے گی بلکہ خود اسلام بھی میرے اس خیال سے بریت ظاہر کرے گا کیونکہ اسلام خدائے تعالیٰ کو ظالم قرار نہیں دیتا اور وہ دنیا سے ہرگز یہ بات منوانا نہیں چاہتا کہ جب تک رسول کریم ﷺ دنیا میں تشریف نہ لائے تھے اس وقت تک خدا تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کیلئے کوئی سامان پیدا نہیں کیا تھا۔ اگر خدائے تعالیٰ قدیم ایام سے اپنے بندوں کی جسمانی ضروریات کو پورا کرتا چلا آیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس نے ان کی روحانی ضروریات کے پورا کرنے کا سامان نہ کیا ہو اور لاکھوں برس تک انسان کو گمراہی میں پڑا رہنے دیا ہو۔ اسلام اس خیال کا بالکل مخالف ہے اور وہ خدائے تعالیٰ کو رب العالمین قرار دیتا ہے یعنی جس کی ربوبیت ہر زمانہ اور ہر ملک کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور کسی خاص قوم یا خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس طرح اس کا سورج ہمیشہ سے اپنی روشنی سے بنی نوع انسان کی جسمانی آنکھوں کو منور کرتا رہا ہے۔ اسی طرح اس کا نور ہمیشہ ہمیش سے انسانی عقل کو اپنی چمکدار شعاؤں سے منور کرتا رہا ہے اور جس طرح چند گیسوں سے مرکب پانی ہمیشہ سے انسان کے جسم کو تازہ رکھنے کیلئے اس کی طرف سے نازل ہوتا رہا ہے اسی طرح راستی اور صداقت سے مرکب وحی روح کو سرسبز و شاداب رکھنے کیلئے اس کی طرف سے اترتی رہی ہے اور اس نے اپنے احسانات سے کسی قوم کو محروم نہیں رکھا۔ نہ تو اس نے ہندوستان کے باشندوں سے بخل کیا ہے' نہ ایران کے باشندوں سے' نہ اس نے چین کے باشندوں سے اپنی موہبت کو روکے رکھا ہے' نہ عرب کے باشندوں سے' نہ ایشیا سے اس کی روحانی بارش روکی گئی ہے نہ یورپ سے' نہ امریکہ کے جنگل اس سے محروم رہے ہیں نہ افریقہ کے ریگستان۔ قرآن کریم بڑے زور سے دعویٰ فرماتا ہے کہ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر : ۲۵) یعنی کوئی بھی ایسی قوم نہیں گزری کہ جس میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی نہیں بھیجا گیا اور اسی طرح فرماتا ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ

رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل : ۳۷) ہر ایک قوم میں ہم نے رسول بھیجے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ اسی طرح ہمارے رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہندوستان میں بھی بعض رسول گزرے ہیں اور ایران کے متعلق جب آپ سے سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں فارسی زبان بھی خدا تعالیٰ کے کلام سے خالی نہیں رہی اور اس کا الہام اس زبان میں بھی اترتا رہا ہے۔ پس ان حالات کی موجودگی میں اگر اسلام اور دیگر مذاہب کا مقابلہ کرتے وقت میں یہ دعویٰ کروں کہ دنیا کی ہدایت کیلئے اگر کوئی مذہب بھیجا گیا ہے تو وہ صرف وہی مذہب ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا تو ایسا دعویٰ خود اسلام کے خلاف ہوگا۔ پس میری پوزیشن مختلف مذاہب کا مقابلہ کرتے وقت دیگر تمام مذاہب کے پیروؤں سے بالکل مختلف ہے کیونکہ وہ اپنے نبیوں کی صداقت کے ثابت کرنے کے لئے دوسری اقوام کے نبیوں کی تکذیب کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن میں اس نبی کی صداقت ثابت کرنے کے لئے جس کی غلامی میں ہونے کا مجھے فخر حاصل ہے اس بات پر مجبور ہوں کہ تمام دنیا کے نبیوں کی تصدیق کروں۔ ایک آریہ ویدوں کے لانیوالے رشیوں کے دعویٰ کو اس وقت تک محفوظ سمجھتا ہے جب تک دنیا میں کوئی اور خدا کا پیارا اور برگزیدہ بندہ جو اس سے براہ راست کلام حاصل کرنے والا ہو ثابت نہ ہو۔ پس وہ اپنے مذاہب کی سچائی ثابت کرنے کیلئے ان تمام راستبازوں کو جو مختلف ممالک میں بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے بھیجے گئے جھوٹا قرار دیتا ہے۔ ایک یہودی یا مسیحی اپنی الہامی کتاب کی عزت اسی میں خیال کرتا ہے کہ ان کے سوا جس قدر کتب خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس کے ان بندوں کی ہدایت کیلئے جو سرزمین شام کے علاوہ اور ممالک میں بستے تھے نازل ہوئی تھیں جھوٹی قرار دی جائیں۔ پس وہ اپنے مذہب کی تائید کیلئے دیگر مذاہب کو سرے سے ہی باطل قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ایک زرتشتی ایران کے باہر کسی الہامی کتاب کے نزول کو اپنے مذہب کے فوائد کے سخت خلاف سمجھتا ہے اور اس لئے ایسے تمام نبیوں کو جو ایران کے باہر گزرے ہوں کاذب اور ایسی تمام کتب اور وحیوں کو جو ایران سے باہر نازل ہوئی ہوں انسانی مفتریات قرار دیتا ہے۔ غرض اسلام کے سوا تمام مذاہب کے پیرو جب تاریخ قدیم کے مفتشوں کی تحقیقات سے کبھی یہ بات معلوم کرتے ہیں کہ کسی زمانہ میں کسی اور ملک میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا یا کوئی اور کتاب خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ بتائی جاتی تھی تو وہ فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا ایک اور دشمن

بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے بالکل برعکس ایک مسلمان کی حالت ہے کہ جب کبھی بھی اس کے سامنے کسی ملک کے کسی نبی کا ذکر کیا جائے تو اس کا دل خوشی سے اچھل پڑتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں قرآن کریم کی صداقت کا ایک اور ثبوت مل جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے فوراً یہ صداقت سے پُر کلام آجاتا ہے کہ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کوئی قوم نہیں ہے کہ جس میں کوئی خدا کا نبی نہ گزر چکا ہو۔ جس قدر ممالک میں جس قدر نبیوں اور جس قدر کتب کا بھی ثبوت ملے اتنا ہی قرآن کریم کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک قوم میں نبی گزرے ہیں اور اسلام کے سوا جس قدر اور مذاہب بھی ثابت ہوں ایک مسلمان کو ان کے معلوم کرنے سے رنج کی بجائے خوشی ہوتی ہے۔ پس اسلام اور دیگر مذاہب کا مقابلہ کرتے وقت میرا یہ کام نہیں کہ میں دیگر مذاہب کو انسانوں کا بنایا ہوا اور مختلف اقوام کے نبیوں اور رشیوں کو نعوذ باللہ مفتری اور کاذب ثابت کروں بلکہ میرا بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے یہ فرض ہے کہ جس قدر راستباز مختلف اقوام اور مختلف ممالک میں گزرے ہیں میں ان کی تصدیق کروں اور بلا کسی انقباض کے جس طرح بنی اسرائیل کے نبیوں کی صداقت کا اقرار کروں اسی طرح ہندوستان کے برگزیدوں رامؑ اور کرشنؑ کی راستبازی کا اور ایران کے بزرگ زرتشتؑ کی صداقت کا اعتراف کروں اور جس قوم کا بھی کوئی راستباز ہو جس نے خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا دعویٰ کیا ہو اور اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت اسے حاصل ہوئی ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کی قبولیت بنی نوع انسان کے دل میں پیدا کر دی ہو اس کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے تسلیم کروں کیونکہ جیسا کہ قرآن کریم مجھے بتاتا ہے کہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (الانعام : ۲۲) اس شخص سے زیادہ ظالم اور قابلِ سزا کون ہو سکتا ہے جو خدائے تعالیٰ پر جھوٹ بولتا ہے اور لوگوں کو جھوٹے الہام بنا بنا کر سناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ اسے خدائے تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں اور اگر ایسا شخص بھی کامیاب اور بامراد ہو سکتا ہے تو پھر خدائے تعالیٰ کی طرف سے آنے والوں میں اور جھوٹوں میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

دوسرے مذاہب کی موجودگی میں اسلام کی ضرورت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام تمام دیگر مذاہب کو جو مختلف ممالک میں پیدا ہوئے اور پھیلے خدائے تعالیٰ کی طرف سے قبول کرتا ہے تو

پھر ان مذاہب کے ہوتے ہوئے اسلام کی کیا ضرورت ہے اور ان کی موجودگی میں اسے دوسرے مذاہب کے پیروان کے سامنے پیش کرنے میں کیا فائدہ ہے۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں اسلام یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ پہلا ہی مذہب نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی تمام بلاد میں اللہ تعالیٰ ہر قوم کی ہدایت کیلئے رسول بھیجتا رہا ہے وہاں یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے جس قدر مذاہب آئے تھے وہ اس وقت کی محدود ضروریات کے مطابق تھے اور اسی لئے ہر ایک قوم میں الگ الگ نبی بھیجے جاتے تھے تا انسانوں کو اس اعلیٰ ترقی کیلئے تیار کیا جائے جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے مقدر تھی اور رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں بوجہ انبیاءؑ کے زمانہ سے بُعد واقع ہو جانے کے تمام دین ہلاکت کے کنارہ پر پہنچے ہوئے تھے اور خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پاک علوم میں انسان نے اپنی نادانی سے بہت سی باتیں اپنی طرف سے زیادہ کر کے اس پاک چشمہ کو مکدر کر دیا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الروم : ۴۲) یعنی خشکی میں بھی اور تری میں بھی لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا ہے۔ اور قرآن کریم کے محاورہ کے مطابق خشکی سے مراد وہ عقل ہوتی ہے جو وحی الٰہی سے مجرد ہو اور تری سے مراد کلام الٰہی ہوتا ہے پس اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ اس وقت اس طرح ظاہر ہو رہا ہے کہ ایک طرف تو خواہشات نفسانی نے لوگوں کی عقلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اور لوگوں کی عقلیں بوجہ وفور ہوا و ہوس خراب ہو رہی ہے اور وہ اقوام جن کا دارومدار صرف عقل پر ہے بوجہ دنیا میں کامل طور پر منہمک ہونے کے اس مقام تک بھی پہنچنے سے محروم ہو رہی ہیں جہاں تک مجرد عقل انسان کو پہنچا سکتی ہے اور کلام الٰہی بھی بگڑ چکا ہے یعنی خدائے تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے مختلف ممالک اور مختلف اوقات میں جو نبی بھیجے تھے ان پر جو کلام نازل ہوا تھا اس میں بھی لوگوں نے اپنی عقل سے ایسے خیالات ملا دیئے ہیں کہ اسے بھی گندہ کر دیا ہے اور اس طرح وہ اقوام جن کا دارومدار کلام الٰہی پر تھا اور جو اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوتی تھیں اب وہ بھی بوجہ اس چشمہ کے مکدر ہونے کے وہ روحانیت حاصل نہیں کر سکتیں جو وہ پہلے اس کے صاف پانی سے حاصل کرتی تھیں اس لئے ان میں بھی کمزوریاں اور بدیاں پھیل رہی ہیں پس جبکہ دنیا کی یہ حالت ہو رہی ہے تو ضرور تھا کہ خدائے تعالیٰ جو اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے ان کی خبرگیری کرے

اور اس ہلاکت سے ان کو بچائے۔ واقعہ میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مختلف مذاہب کے متبعین کی ایسی ہی حالت تھی جیسا کہ ایک بلند مینار کے اردگرد مختلف رسے لٹک رہے ہوں اور کچھ لوگ ان مختلف رسوں کو پکڑ کر اس پر چڑھنا چاہیں تو سرے پر جا کر ان کے ہاتھ چھوٹ جائیں اور ان کے گرنے میں سوائے اس کے اور کوئی روک نہ ہو کہ ان کا کوئی کپڑا رسہ کے کسی حصہ سے لپٹ جائے اور وہ اس طرح اوندھے مونہہ ہوا میں معلق پڑے ہوئے ہوں۔ مختلف زمانہ میں انبیاءؑ نے مختلف اقوام کو روحانیت کے بلند مینار پر چڑھانا شروع کیا جس کی وجہ سے استعدادوں میں تو ترقی ہو گئی لیکن رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں انبیاءؑ سے بُعد کی وجہ سے مختلف مذاہب کے پیرو عملی اور اعتقادی حالت میں ایسے گر گئے کہ اگر اس وقت کوئی ان کو ہدایت کی طرف بلانے والا نہ آتا تو وہ بالکل ہلاک ہو جاتے اور وہ تمام کوششیں جو مختلف انبیاءؑ نے کی تھیں اکارت جاتیں۔ لیکن جیسا کہ قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے وہ دنیا کا نجات دہندہ عین وقت پر آگیا اور اس نے ان اوندھے مونہہ لٹکتے ہوئے انسانوں کو جو یوں تو مینار کے سر پر پہنچ گئے تھے لیکن اپنی موجودہ حالت میں نیچے کھڑے ہوئے انسانوں سے بھی زیادہ خطرہ میں تھے ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر اوپر اٹھالیا اور ان مختلف لوگوں کو جو مختلف جہات سے چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مینار کی بلندی پر ایک ہی جگہ اکٹھا کر دیا اور آئندہ کیلئے سب دنیا کیلئے ایک ہی مذہب اور ایک ہی کتاب قرار پائی کیونکہ تمدن کی ترقی نے اب سب دنیا کو ایک ہی ملک کی طرح اور سب بنی نوع انسان کو ایک ہی قوم کی طرح کر دیا تھا اور وہ پہلا دن تھا جب کہ برادرہڈ آف مین (اخوت انسانی) پر اس کے حقیقی معنوں میں عمل کیا گیا اور رسول کریم ﷺ نے حکم الٰہی کے ماتحت بڑے زور سے دنیا میں اعلان کیا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف : ۱۵۹) اے لوگو! میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے تم سب کی طرف بلا استثناء کے رسول بنا کر اس خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں جس کے قبضہ میں آسمان و زمین کی بادشاہت ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے غیب کی خبریں قبل از وقت سناتا ہے جو اسی طرح گناہ سے پاک ہے جس طرح وہ بچہ جو ابھی ماں سے جدا نہیں کیا گیا اور جو تم کو ہی ایمان و عمل کی طرف نہیں

بلاتا بلکہ خود بھی خدائے تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور اس کے تمام احکام کو قبول کرتا ہے پس تم اس کی فرمانبرداری کرو تاکہ تم خدائے تعالیٰ تک پہنچ سکو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ تمام دنیا کی طرف ایک ہی رسول اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تا اس ذریعہ سے وہ خدا جو زمین و آسمان کا ایک ہی خدا ہے اپنے پورے جلال کے ساتھ ایک ہی رسول کے ذریعہ سے سب دنیا پر ظاہر ہو اور تا اس کی توحید ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہو اور یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت دنیا کو چھوڑ دیتا حالانکہ وہ زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہے۔ پس اس کی صفت احیاء نے چاہا کہ مردہ زمین کو پھر زندہ کرے اور جو مذاہب کہ اب دنیا کی ہدایت کیلئے کار آمد نہیں ان کو مردہ مذاہب میں شامل کر دے یعنی ان کو منسوخ کر کے ایک کار آمد اور کل انسانی ضروریات کو پورا کرنے والا مذہب دنیا میں پھیلائے اور یہ دعویٰ ایک ایسا دعویٰ تھا جو نہ تو ہند کے رشیوں نے نہ ایران کے داناؤں نے نہ شام کے نبیوں نے کیا تھا بلکہ وہ ایک ہی قوم یا ایک ہی ملک کی طرف آئے تھے اور اگر کسی قوم نے اپنی تبلیغ کو کسی وقت وسیع بھی کیا ہے تو بانیان مذہب کی تعلیم کے خلاف اور ان کے بعد ایسا کیا ہے جیسا کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں سے سب سے بڑے تبلیغی مذہب یعنی مسیحیت کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت مسیحؑ نے تو تبلیغ عام سے روکا لیکن ان کے بعد تبلیغ عام کر دی گئی پس وہ اس مذہب کا حصہ نہیں کہلا سکتی۔ غرض اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے جس قدر مذاہب تھے وہ دو وجوہات سے منسوخ کر دیئے گئے اول تو یہ کہ ان کی بعض تعلیمیں وقتی تھیں اور ایک خاص قوم یا خاص ملک یا خاص زمانہ کے حالات کے مطابق تھیں اور اللہ تعالیٰ کی کامل حکمت چاہتی تھی کہ اب ان کو منسوخ کر دیا جائے اور ایک ایسی تعلیم بھیجی جائے جو سب قوموں اور سب ملکوں اور سب زمانوں کے مطابق حال ہو۔ اور دوم اس لئے کہ پہلی کتب کی اصل تعلیم بھی بہت کچھ بگڑ چکی تھی اور ان کی الہامی کتابیں اس شکل میں نہ رہی تھیں جس میں کہ وہ نازل ہوئی تھیں اور اب ان پر عمل کرنا ایک محقق انسان کیلئے مشکل ہو گیا تھا کیونکہ وہ اس کے لئے بوجہ مشکوک ہونے کے باعث تسلی نہ رہی تھیں اور باوجود ان کے اندر بہت سی صداقتوں کے موجود ہونے کے انسان یقین اور تسلی سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جس حکم پر عمل کر رہا ہے واقعہ میں وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے بھی یا نہیں۔ پس اس بے اعتباری اور شک کو دور کرنے کیلئے جو روحانی ترقیات کیلئے ایک مہلک زہر کی طرح ہوتا ہے خدائے تعالیٰ نے چاہا کہ ایک نیا کلام اور نئی شریعت نازل کرے جس پر

انسان بلا کھٹکے کے عمل کر سکے اور جس کے ہر ایک لفظ کی نسبت اسے یقین ہو کہ یہ خدائے تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور اسلام اور دیگر مذاہب میں یہ بھی ایک عظیم الشان فرق ہے کہ دیگر مذاہب میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کی مذہبی کتب اسی طرح محفوظ ہوں جس طرح وہ نازل ہوئی تھیں یا جن کے محفوظ ہونے کا کوئی قطعی ثبوت ہو۔ لیکن اسلام کی کتاب قرآن کریم کی نسبت زبردست تاریخی شہادتوں کی بناء پر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی اسی شکل میں ہے جس شکل میں کہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس لئے جو تسلی ایک مسلم کو قرآن کریم پر عمل کرتے وقت ہو سکتی ہے وہ کسی اور مذہب کے پیرو کو اپنی الہامی کتب پر نہیں ہو سکتی کیونکہ باقی تمام کی تمام کتب کا یہی حال ہے کہ یا تو زبردست تاریخی شہادتوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ ان کی اصل شکل اس وقت قائم نہیں ہے اور یا وہ ایسے تاریک زمانوں میں سے گزری ہیں کہ ہرگز یقین کے ساتھ ان کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر ہیں۔

اس اعتراض کا جواب کہ پہلی کتب کی کیوں خدائے تعالیٰ نے حفاظت نہ کی

اور یہ اعتراض ہرگز قابل وقعت نہیں کہ پہلی کتب کی کیوں خدائے تعالیٰ نے حفاظت نہ کی کیونکہ ابتدائی زمانہ میں مختلف اقوام ایک دوسرے سے کیا بلحاظ مسافت کے اور کیا بلحاظ تمدن کے اتنے بُعد پر تھیں کہ ان کے لئے ایک کتاب نہیں بھیجی جا سکتی تھی اور روحانی حالت بھی اس وقت ابتدائی منازل میں سے گزر رہی تھی۔ پس ضرور تھا کہ اس وقت کی ضروریات کے مطابق ہر ایک علاقہ میں الگ نبی اور الگ کتاب بھیجی جاتی اور چونکہ ان ابتدائی کتب نے بہرحال انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ منسوخ ہونا تھا اس لئے ان کی حفاظت کی کوئی ضرورت نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ دعویٰ صرف قرآن کریم میں ہی ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر : ۱۰) ہم ہی نے اس کتاب کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرے گا اور اسے بگڑنے نہ دے گا اور یہ وہ دعویٰ ہے جو قرآن کریم کے سوا کسی اور کتاب نے نہیں کیا۔ اگر کیا ہے تو کوئی شخص ہمیں کسی الہامی کتاب کا یہ دعویٰ دکھائے ہم اس کے نہایت ممنون احسان ہوں گے۔ لیکن قرآن کریم کے سوا کوئی الہامی کتاب ایسا دعویٰ نہیں کرتی اور کر بھی نہیں سکتی کیونکہ قرآن کے سوا کوئی اور کتاب نہیں جس نے سب دنیا کیلئے ہونے کا اور پھر ہر رنگ میں کامل ہونے کا دعویٰ کیا ہو اور اگر ان دونوں دعوؤں کے بغیر کوئی کتاب ایسا

دعویٰ کرتی تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ یا تو قیامت تک باوجود تمدن کی ترقی کے اور بنی نوع انسان کے جسمانی اور روحانی اختلاط کے خدائے تعالیٰ نے بلاوجہ نعوذ باللہ کل انسانوں کو مذہباً جدا جدا رکھنا چاہا ہے اور اس اتحاد سے جو تمام ترقیات کی جڑھ ہے محروم رکھنا پسند کیا ہے اور یا پھر یہ قبول کرنا پڑتا کہ اللہ تعالیٰ نے باوجود انسان کے ہر رنگ میں ترقی پا جانے کے کامل شریعت سے اسے حصہ نہیں دیا اور ان شرائع کو بلا ضرورت بلکہ خلاف مصلحت جاری رکھا جو کہ صرف خاص اوقات اور خاص زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اور یہ دونوں باتیں کوئی دانا انسان قبول نہیں کر سکتا۔ پس چونکہ دیگر کتب نہ تو سب جہان کیلئے تھیں اور نہ ان کی تعلیم انسانی اعمال کے تمام شعبوں کے متعلق احکام پر حاوی تھیں اس لئے ہرگز ضروری نہ تھا کہ ان کی خاص طور پر حفاظت کی جاتی۔ اور ان کا حال ایسا ہی تھا کہ جیسے کسی ضرورت کے وقت ایک جگہ پر عارضی کیمپ لگائے جاتے ہیں تو ان کی حفاظت اس رنگ میں نہیں کی جاتی جس رنگ میں ان عمارتوں کی جو ہمیشہ کے قیام کیلئے بنائی جاتی ہیں کیونکہ اول الذکر کا فائدہ صرف عارضی ہوتا ہے اور اس فائدہ کے حاصل ہو چکنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی لیکن آخر الذکر کے ساتھ ہمیشہ کا تعلق ہوتا ہے اس لئے اس کی حفاظت کی جانی ضروری ہوتی ہے۔

قرآن کا دعویٰ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی الہامی کتاب نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں اور تمام آئندہ زمانوں کیلئے ہے جیسا کہ فرمایا کہ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ۔ (الانعام:۲۰) یعنی اے زمانہ کے لوگو! یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے. تاکہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے خدائے تعالیٰ کے غضب سے ڈراؤں اور ان کو بھی جن کو یہ قرآن پہنچتا جائے یعنی اس کتاب کے متعلق کسی خاص زمانہ اور کسی خاص ملک کی شرط نہیں جسے اس کی خبر ملے اس پر اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا فرض ہے۔[1] اسی طرح اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔ (المائدہ:۴) یعنی آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین ہر رنگ میں کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔ اور ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس کتاب کی نسبت یہ بھی کہا جاتا کہ خدائے تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا کیونکہ جو کتاب کامل ہو گئی اس کے منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں اور جو ہر زمانہ کیلئے ہے اس کی حفاظت کئے بغیر چارہ نہیں

اسلام میں اور دوسرے مذاہب میں فرق

میرے پچھلے مضمون سے یہ بات بپایۂ ثبوت پہنچ جاتی ہے کہ اسلام سب ادیان کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہے لیکن اس بات کا مدعی ہے کہ جس وقت اسلام آیا اس وقت سب مذاہب بگڑ چکے تھے اس لئے خدائے تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کیلئے قرآن کریم اتارا اور چونکہ انسان کی روحانی استعداد کامل ہو چکی تھی اور دنیا بھی اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ تمام عالم آپس میں مل جائے جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا اس لئے خدائے تعالیٰ نے ایک کامل اور مکمل دین دنیا کی طرف بھیجا تا اسے ترقی کے کمال پر پہنچائے۔ پس اس اصل کے ماتحت ہم جو اسلام کا مقابلہ دیگر ادیان کے ساتھ کرتے ہیں تو یا تو اس لئے کہ ان مذاہب میں بعض خوبیاں تھیں لیکن مرور زمانہ کے سبب سے وہ بعد میں مٹ گئیں یا ان کی جگہ بعض انسانوں نے اپنے بعض مطالب کو پورا کرنے کے لئے کچھ اور تعلیم ملا دی اور یا اس لئے کہ اس میں جو تعلیم تھی وہ بنفسہٖ تو اچھی تھی لیکن ایسی نہ تھی کہ ہر زمانہ اور ہر وقت میں کام آ سکتی اور اس میں خاص حالات کو مدِنظر رکھ کر انسانی فطرت کے کسی خاص پہلو پر یا انسانی فرائض میں سے کسی خاص فرض پر زور دیا گیا تھا اور انسانی فطرت کے بعض دیگر پہلوؤں یا اس کے بعض فرائض کو یا تو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا یا ایسے دبے الفاظ میں ان کا ذکر تھا کہ وہ انسانی اعمال کی درستی کیلئے پورے طور پر مؤثر نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ اسلام اور دیگر مذاہب کے اس فرق کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ (البقرۃ: ۱۴۴) اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنایا ہے کہ جو اپنے اعمال میں ایک درمیانی رنگ رکھتی ہے۔ اور نہ تو افراط کی طرف جھک جاتی ہے اور نہ تفریط کی طرف مائل ہو جاتی ہے بلکہ اس کے اعمال ترازو کے تول کی طرح ایسے درمیان میں رہتے ہیں کہ کسی پہلو کو ان میں نظرانداز نہیں کیا جاتا اور ہم نے تم کو ایسا اس لئے بنایا ہے کہ تا تم دوسرے مذاہب اور دوسری اقوام کیلئے ایک گواہ کی طرح ہو یعنی جس طرح گواہ کی گواہی سے ثابت ہوتا ہے کہ حق کیا ہے اور کس کا ہے اسی طرح تم میں سے جو لوگ قرآن کریم کی تعلیم پر چل کر اس کے نیک اثرات کو اپنے اندر پیدا کریں وہ دوسری اقوام کیلئے جو اب تک قرآن کریم کی صداقت سے لذت آشنا نہیں اس کی صداقت اور اس کے وسیع اور روحانی زندگی میں تغیر عظیم پیدا کرنے والے اثرات پر بطور ایک شاہد کے

ہوں یعنی زبان اور عمل دونوں سے اس بات کا اقرار کریں کہ انہوں نے اس کے دعاوی کو سچ پایا اور لوگ ان کی پاکیزہ زندگی اور آسمانی نصرت کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ سچا راستہ یہی ہے جس پر یہ لوگ چلتے ہیں اور پھر آخر میں بتایا کہ جس طرح ان مسلمانوں کو جو قرآن کریم کی تعلیم پر چلتے ہیں دوسری اقوام کیلئے شاہد بنایا ہے رسول کریم ﷺ کو اس جماعت کیلئے شاہد بنایا ہے یعنی ان کے دل میں آپ کی زندگی کو دیکھ کر اسلام کی صداقت گھر کر جاتی ہے۔ غرض قرآن کریم نے خود دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کو دیگر مذاہب پر یہ فضیلت ہے کہ اس میں کسی بات میں افراط تفریط سے کام نہیں لیا گیا بلکہ اس کی تعلیم درمیانی ہے اور اس لئے ہر زمانہ اور ہر ملک و قوم کیلئے ہر حالت میں کار آمد ہے اور گو قرآن کریم میں اور بھی بیسیوں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں خوبیاں ایسی مذکور ہیں اور احادیث رسول کریم ﷺ میں بھی بڑی کثرت سے ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن میں اس وقت صرف ایک ایسی خوبی پر نہایت اختصار سے کچھ بیان کروں گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور جس کا کوئی حکم ایسا نہیں کہ کسی خاص مصلحت اور زمانہ کیلئے دیا گیا ہو اور بعد میں اس کی ضرورت نہ رہی ہو۔ پس وہی ایک مذہب ہے جس کی طرف طالبان صداقت کو دوڑنا چاہئے اور جان بیچ کر بھی اسے خریدنا چاہئے کیونکہ نیک انسان کے لئے صداقت سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہیں۔ میں اس نہایت ہی مختصر مقابلہ میں زیادہ زور صرف اسلام کی خوبیوں کے بیان پر دوں گا اور دیگر مذاہب کے جو احکام کہ بگڑ گئے ہیں یا وہ ہر ایک زمانہ میں اور ہر حالت میں قابل عمل نہیں ہیں ان کی طرف صرف اشارہ کرنا کافی سمجھوں گا کیونکہ اول تو گنجائش نہیں۔ دوم بعض لوگ شاید ان تفاصیل سے کسی قدر گھبرائیں۔

مذہب کی غرض

پیشتر اس کے کہ ہم اسلام اور دیگر مذاہب کا اس خاص پہلو میں مقابلہ کریں جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں یہ دیکھنا چاہئے کہ مذہب کی غرض کیا ہوتی ہے تا غور کیا جا سکے کہ ان اغراض کے پورا کرنے میں میانہ روی کا پہلو کس مذہب نے اختیار کیا ہے۔ قرآن کریم مذہب کی دو ہی غرضیں بتاتا ہے ایک حقوق اللہ کی بجا آوری اور دوسری حقوق العباد کی نگہداشت اور دیگر مذاہب بھی اس بات میں قرآن کریم کے مخالف نہیں۔ پس ہم اس مقابلہ میں ان دونوں پہلوؤں کو لیتے ہیں۔

تعلق باللہ

قلبی تعلق کن وجوہات سے پیدا ہوتا ہے

اس مقابلہ میں سب سے پہلے ہم تعلق باللہ کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اسلام نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندوں کا تعلق قائم کرنے کے لئے کیا تدبیر کی ہے مگر پیشتر اس کے کہ ہم ان تدابیر کو بیان کریں جو اسلام نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندوں کا تعلق قائم کرنے کے متعلق اختیار کی ہیں اس مضمون کو زیادہ سہل اور آسان کرنے کے لئے ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ انسان کے اندر وہ کون سی مخفی قوتیں ہیں جن کے ذریعہ سے اس کا کسی اور چیز سے قلبی تعلق قائم ہوتا ہے اور کسی اپنے سے برتر ہستی کی فرمانبرداری وہ کن قوتوں کے حکم کے ماتحت کرتا ہے۔ سو یاد رہے کہ انسان کا تعلق قلبی کسی دوسری شئے سے صرف دو ہی جذبات کے نیچے ہوتا ہے یا محبت کی وجہ سے اور یا خوف کی وجہ سے۔ جس قدر دوستیاں اور تعلقات ہیں ان سب پر غور کر کے دیکھ لو کہ ان کی وجہ یا محبت ہے یا خوف۔ یا تو ایک چیز سے انسان کو محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اس کی جدائی کو ناپسند کرتا ہے اس کے قریب ہونے کے لئے کوشاں رہتا ہے حتّٰی کہ اپنے محبوب کے حق میں جو چیز مضر ہو یا جو اسے ناپسند ہو اس سے یہ بھی نفرت کرنے لگ جاتا ہے اور جو چیز یا جو کام اپنے محبوب کا پسندیدہ پائے یا اس سے اسے نفع پہنچتا دیکھے تو اسے خود بھی پسند کرنے لگتا ہے۔ غرض محبت کی وجہ سے اپنے محبوب کی ہر پسندیدہ شئے کو پسندیدہ اور ہر ناپسند شئے کو ناپسند سمجھنے لگتا ہے اور محبت کی ترقی کے ساتھ اس کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ پھر اپنے محبوب کی رضا کو پورا کرنا اس کی طبیعت ثانیہ ہو جاتا ہے اور یہ ایسا خیال کرتا ہے کہ گویا بعض کام اسے خود طبعاً پسند ہیں اور بعض ناپسند لیکن درحقیقت ان کاموں سے نفرت یا ان کی طرف رغبت اس محبوب کے خیالات کا عکس یا ظل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تعلق صرف خوف کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اگر خوف جاتا رہے تو فوراً وہ تعلق ٹوٹ جائے چنانچہ بعض لوگ بعض درندوں کو پالتے ہیں اور ان کو سدھا لیتے ہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کا تعلق ان درندوں سے صرف خوف کا ہوتا ہے اسی لئے وہ ان کے پاس جاتے ہوئے کوڑا یا

تلوار رکھتے ہیں اور بارہا ایسا ہؤا ہے کہ اگر کسی وقت وہ کوڑا یا تلوار بھول گئے اور وہ یونہی اس درندہ کے پاس چلے گئے تو اس نے ان پر حملہ کر دیا اور قتل یا زخمی کر دیا یہی حال بعض درندہ طبع انسانوں کا ہوتا ہے کہ وہ بھی محبت اور پیار سے کبھی نہیں مانتے۔ بہت ہیں کہ وہ اپنے والدین تک کو کہ جن کے احسانات انسانوں میں سے سب سے زیادہ ہوتے ہیں زدوکوب کرتے ہیں اور ان سے سخت حقارت و نفرت کرتے ہیں اور بعض بالغ ہو کر ان کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے ان کو زہر تک دے دیتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ حکام وقت کے سامنے نہیں بولتے اور بظاہر ان کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور ان کے سامنے ایسے ہو جاتے ہیں کہ جیسے کوئی شرمیلا بچہ ہوتا ہے۔ اور یہ ان کا تعلق اور فرمانبرداری صرف اسی خوف کی وجہ سے ہوتی ہے کہ اگر ظاہر میں ہم نے قانون توڑ دیا تو ہمیں سزا ملے گی ورنہ اگر حکام وقت اور حکومت ملک ان کو صرف پیار اور محبت سے منوانا چاہے تو وہ ایک دن میں اس سے جدا ہو جائیں اور فوراً اس کا مقابلہ شروع کر دیں۔ غرض انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق دو وجہ سے ہوتے ہیں یا تو محبت سے یا خوف سے۔

محبت کے اسباب

اسی طرح محبت کے اسباب کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس کے بھی دو سبب معلوم ہوتے ہیں یا حسن یا احسان یعنی یا تو انسان کسی شئے سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے خواہ شکل کے لحاظ سے خواہ اخلاق کے لحاظ سے خواہ علم کے لحاظ سے خواہ عقل کے لحاظ سے غرض کسی قسم کی خوبصورتی ہو بعض انسان اس پر فدا ہوتے ہیں۔ سجے ہوئے مکان اور تصاویر اور سبزہ زار زمینیں اور بعض بے خوشبو کے خوش رنگ پھول اسی قسم کی اشیاء میں سے ہیں کہ جن سے انسان اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ خوبصورت ہیں ورنہ ان سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ ان پر خرچ کرنا پڑتا ہے اسی طرح خوبصورت انسانوں سے لوگ محبت کرتے ہیں اور یہ خوبصورتی جیسا کہ اوپر بیان ہؤا کئی قسم کی ہوتی ہیں کبھی تو ان کی شکل خوبصورت ہوتی ہے اور کبھی ان کے اخلاق اور ان کا علم و عقل وغیرہ خصائل و قوتیں اچھی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان سے لوگ محبت کرتے ہیں دوسرا سبب محبت پیدا کرنے کا احسان ہوتا ہے اور بہت سے تعلقات محبت احسان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ ماں باپ سے محبت کا ایک بہت بڑا باعث ان کے احسانات بھی ہوتے ہیں جو وہ بچہ کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے برسرِ کار ہونے تک اس پر کرتے ہیں۔ اسی طرح

ایک ملازم اپنے محسن آقا سے محبت کرتا ہے اور ایک آقا اپنے وفادار خادم سے محبت کرتا ہے اور وفا بھی ایک قسم احسان کی ہی ہوتی ہے کیونکہ وفا احسان کے بدلہ کا نام ہے اور احسان کا بدلہ سوائے احسان کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خاوند اور بیوی کی محبت ہوتی ہے کہ وہ بھی حسن و احسان دونوں ذرائع سے پیدا ہوتی ہے۔ غرض جس قدر محبت کے تعلقات ہوتے ہیں وہ سب کے سب حسن اور احسان سے متفرع ہوتے ہیں چنانچہ بھائیوں کی محبت بھی انہیں دو ذرائع سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ یہ محبت طفیلی ہوتی ہے اور دراصل اس کا باعث وہ تعلق ہے جو اولاد کو ماں باپ سے ہوتا ہے اور چونکہ بھائی بہن ایک محبوب کے محبوب بلکہ جزو بدن ہوتے ہیں اس لئے بالطبع ایک بھائی دوسرے بھائی یا بہن سے محبت کرتا ہے اور بہت دفعہ نہیں جانتا کہ اس محبت کا باعث کیا ہے۔ غرض محبت کا باعث یا تو حسن ہوتا ہے یا احسان۔ اور احسان کا تعلق پھر دو قسم پر منقسم ہے یا تو کسی کے احسان کی وجہ سے ایک شخص سے محبت کی جاتی ہے یا اپنی محسن طبیعت کی وجہ سے کوئی شخص دوسرے سے محبت کرتا ہے اور یہ محبت رأفت و شفقت ہوتی ہے جو اس کی اپنی محسن طبیعت کا نتیجہ ہوتی ہے جب ہم انسانی فطرت کا اور بھی گہرا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بعض آدمیوں کے اندر تو یہ تینوں خاصے پائے جاتے ہیں یعنی ان کے تعلقات تینوں قسم کے ہوتے ہیں بعض خوف سے بعض محبتِ حسن سے بعض محبتِ احسان سے لیکن بعض کے اندر ان تینوں خاصوں میں سے ایک یا دو بعض وجوہ سے تلف بھی ہو جاتے ہیں یعنی وہ صرف حسن یا صرف احسان یا صرف خوف کے جذبات سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے جذبہ کا ہیجان ان کے اندر نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ ایسے دیکھے جائیں گے کہ جب تک محبت سے ان سے کام لیتے رہو وہ خوشی سے کریں گے۔ ذرا ان پر سختی کرو یا رعب بٹھاؤ وہ فوراً مقابلہ کیلئے کھڑے ہو جائیں گے۔ بعض لوگ محبت کے دونوں بواعث یعنی حسن یا احسان کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ کریں گے لیکن خوف سے فوراً مطیع ہو جائیں گے۔

انسانی فطرت کے اس مطالعہ کے بعد ہمیں لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہی تعلیم ہر ایک زمانہ اور ہر ایک ملک اور ہر ایک انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے جس میں ان تینوں جذبات کو ہیجان میں لا کر تعلق پیدا کرنے کی صورت کی جائے اور اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو صرف خدائے تعالیٰ کے حسن پر زور دیتا ہے اور ایسی محبت کی طرف انسان کو بلاتا ہے جس کا باعث کوئی خواہش یا طلب انعام نہ ہو اور کسی بدلہ کی امید جس کے ساتھ نہ ہو تو وہ ایک انسانی گروہ کا تو لحاظ کر لیتا

ہے لیکن دو دوسرے گروہوں کا جو احسان یا خوف کے بغیر تعلق نہیں پیدا کرتے اور نیک یا بد کسی نہ کسی سبب سے ان کے اندر وہ جذبہ مرگیا ہے جو صرف حسن سے محبت کو جوش میں لاتا اور اس طرح تعلق پیدا کراتا ہے تو ایسے لوگ اس مذہب کے ذریعہ سے ہرگز خدائے تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے اور ضرور ہے کہ ان کی طبیعت اپنا علاج نہ پاکر دین سے بیزار ہو جائے اور اس طرح ہمیشہ کی ہلاکت میں گر جائے۔ اسی طرح اگر کوئی مذہب صرف احسان پر زور دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کی طرف متوجہ کر کے اس کا تعلق اس سے قائم کرنا چاہتا ہے جو وہ اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو دیتا ہے تو یہ مذہب بھی ایک طرف جھک جاتا ہے اور میانہ روی کو ترک کر دیتا ہے اور وہ طبائع جو حسن و خوف سے تعلق پیدا کیا کرتی ہیں ان کی بیماری کا علاج اس مذہب میں نہیں اور ایسی تمام طبائع اس مذہب کے ذریعہ سے خدائے تعالیٰ تک نہیں لائی جا سکتیں اسی طرح اگر کوئی مذہب خوف خدا پر ہی زور دیتا ہے تو اسے ایسی بھیانک شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس سے قطعاً کسی بخشش اور رحم کی امید نہیں تو بے شک وہ لوگ جو خوف کا اثر اپنے دل میں قبول کرتے ہیں اس مذہب کے ذریعہ سے کچھ فائدہ اٹھائیں تو اٹھائیں لیکن وہ طبائع جو محبت سے تعلق پیدا کرنے کی عادی ہیں کبھی اس مذہب سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں اور جو لوگ خوف سے تعلق پیدا کرتے ہیں ان کا تعلق درحقیقت ایک عارضی تعلق ہوتا ہے اور ان انعامات کا ہرگز مستحق نہیں بناتا جن کا مستحق تعلق محبت بناتا ہے پس وہ مذہب جو خدا محبت ہے کہہ کر دنیا کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اور صرف ایک عقیدہ پر ایمان لانے پر نجات کو منحصر کرتا ہے اور اعمال کے پہلو کو بالکل بھلا دیتا ہے کبھی کل بنی نوع انسان کیلئے کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ بہت ہیں جو صرف ایمان پر اپنا مدار رکھ کر اپنی خونی طبیعت کے نیچے دب جائیں گے اور خدا کی محبت خواہ کیسے ہی اعلیٰ سے اعلیٰ رنگ میں ان کے سامنے پیش کی جائے وہ اس سے متأثر نہ ہوں گے اور اسی طرح خدا سے دور جا پڑیں گے جیسے کہ وہ بدبخت جو اپنے ماں باپ کے احسانات کو دیکھتے ہوئے پھر ان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مذہب جو کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا یک طرفہ معاملہ کرتا ہے کہ اس نے اپنا تمام تعلق ایک قوم سے مخصوص کر دیا ہے اور اس کے سب چیدہ انعامات صرف ایک خاص نسل کے ساتھ وابستہ ہونے پر ملتے ہیں کبھی سب دنیا کی اصلاح کرنے والا مذہب نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا مذہب خدائے تعالیٰ کے متعلق انسانوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہے نہ محبت پھر اسی طرح وہ مذہب جو خدائے تعالیٰ کے

متعلق یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ وہ کبھی کوئی گناہ نہیں بخشا اور نہ بخش سکتا ہے وہ گو زبان سے اسے باپ یا ماں یا اس سے بھی زیادہ مہربان کہے لیکن ایسا مذہب اس خالق فطرت کی طرف سے نہیں ہو سکتا جس نے انسانوں کے دلوں میں بھی ایسا رحم پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے گناہ گاروں کو بخشتے ہیں حالانکہ ان کے دشمنوں نے ان کا فی الواقعہ نقصان کیا ہوتا ہے لیکن کبھی انسان کے کسی فعل سے خدائے تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ مذہب جو کہتا ہے کہ خدائے تعالیٰ انسان کے گناہوں میں سے نجات دیتے وقت بعض گناہ رکھ لیتا ہے اور ان کی سزا میں پھر اسے دار العمل کی طرف واپس کرتا ہے کبھی خدائے تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا باعث نہیں ہو سکتا کیونکہ اس عقیدہ سے خدائے تعالیٰ سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی مایوسی پیدا ہو کر انسان گناہوں پر اور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ پس درحقیقت وہی مذہب تمام دنیا کیلئے ہو سکتا ہے جو ان تمام باتوں میں میانہ روی اختیار کرتا ہے اور ایک طرف تو خدائے تعالیٰ کا حسن پیش کر کے دنیا سے محبت کا خراج لیتا ہے اور اس کے احسانات قدیم و جدید یاد دلا کر اس کے جذبہ محبت کو ابھارتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کی عظمت اس کے جبروت اس کی بدیوں سے نفرت کا نقشہ کھینچ کر اسے اس سے تعلق پیدا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہ مذہب صرف اسلام ہی ہے۔

اسلام میں ہر طبیعت کے انسان کا علاج موجود ہے

چنانچہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورۃ میں جسے مسلمان ہر نماز میں پڑھتے ہیں اسی مضمون کو ادا کر کے ہر طبیعت کے انسان کا علاج کیا گیا ہے چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ بندہ کی طرف سے حکایۃً فرماتا ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی میں شروع کرتا ہوں خدا کا نام لے کر جو رحمٰن ہے رحیم ہے سب خوبیاں اور سب حسن اور سب خوبصورتیاں جو کسی تعریف کی مستحق ہیں اور انسان کے دل سے کسی چیز کی تعریف نکلوا سکتی ہیں وہ سب کی سب خدائے تعالیٰ میں جمع ہیں پھر وہ صرف حسین ہی نہیں بلکہ محسن بھی ہے وہ رب ہے تمام جہانوں کا کہ اس نے تمام مادہ اور ارواح پیدا کی ہیں اور پھر ان کی انفرادی یا اجتماعی حالتوں میں ان کی خبر گیری کرتا ہے اور ہر ایک قسم کی تربیت کر کے ان کی طاقتوں اور قوتوں کو نشوونما دے کر کمال تک پہنچاتا ہے وہ ایسا مہربان ہے کہ خدمت کا بدلہ ہی نہیں دیتا بلکہ بلا کسی کام یا خدمت کے اپنے پاس سے بھی بندہ پر اپنے فضل کی بارش کرتا ہے اور اسی پر بس نہیں۔

جو لوگ ان فضلوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اس کی طرف سے ملتے ہیں اور ان کو صحیح طور پر اور ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں جہاں ان کا استعمال کرنا مناسب ہے تو وہ اس فعل پر اور بھی فضلوں کی بارش کرتا ہے اور جس قدر انسان کام کرے اس کا بدلہ دے کر پھر زائد انعام دیتا ہے اور وہ جزاء و سزا کے دن کا مالک ہے یعنی نہ صرف یہی کہ نہایت حسین اور محسن ہے بلکہ انسان کے تمام افعال کا ایک وقت مقررہ پر وہ جائزہ بھی لیتا ہے اور پھر اپنے مالکانہ اقتدار کے ساتھ نیک کو انعام اور شریر کو سزا دیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی۔ مالک کے لفظ میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اس کا انعام بھی بڑا ہوتا ہے اور اس کی سزا بھی سخت ہوتی ہے کیونکہ جو مالک نہ ہو اس کی سزا سے انسان بچ جاتا ہے جیسا کہ بادشاہ کسی کو سزا دینے لگے اور وہ مر جائے یا کسی تکلیف کے عذاب کے خیال سے خودکشی کر لے تو اس بادشاہ کی سزا سے وہ بچ جائے گا لیکن فرمایا کہ ہم مالکانہ اقتدار رکھتے ہیں اور ہمارے قبضہ سے نکل جانا کسی کی طاقت میں نہیں پس اگر تمہارے لئے کوئی اور بات ہم سے تعلق پیدا کرنے کا باعث نہیں ہو سکتی تو اس بات کا خیال رکھو کہ ہم حکم عدولی پر سزا بھی سخت دیتے ہیں چنانچہ آگے فرمایا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی بندہ جب ان تمام صفات پر غور کرتا ہے تو خواہ کسی خیال اور کسی طبیعت کا انسان ہو حسن پر شیدا ہو جانے والا ہو یا احسان پر یا خوف سے ماننے والا ہو۔ وہ اپنی طبیعت کے مطابق سورۃ فاتحہ میں علاج پالیتا ہے اور بے اختیار ہو کر کہہ اٹھتا ہے کہ اے خدا! میں تیری ہی فرمانبرداری کرتا ہوں یعنی جب وہ سب باتیں جن کی وجہ سے کسی ہستی سے محبت اور پیار کیا جاتا ہے تجھ میں پائی جاتی ہیں تو پھر تیرے سوا اور کس سے میں تعلق پیدا کر سکتا ہوں۔ ان الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مؤمن جب کامل تعلق اللہ تعالیٰ سے پیدا کر لیتا ہے تو اس کی محبت اور خوف دونوں اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور آئندہ نہ محبت میں نہ خوف میں خدائے تعالیٰ کا شریک کسی کو نہیں کرتا اگر وہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو خدا کیلئے اور خدا میں ہو کر اور اگر وہ خوف کرتا ہے تو خدا کے حکم سے اور انہی سے جن کی نافرمانی سے بچنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ اور چونکہ جب ان صفات کاملہ پر انسان غور کرے تو وہ محبت یا خوف کی وجہ سے بے اختیار ہو جاتا ہے اور محبت و خوف اس پر اس قدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ وہ اب اپنی ذات کو حقیر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل بے جان خیال کرتا ہے۔ اس لئے اس خیال کی ترجمانی کرنے کے لئے ساتھ ہی فرما دیا کہ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی آپ کے اس حسن اور احسان اور اس طاقت و جلال

کو معلوم کر کے ہم اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کر سکتے کہ وہ ان لوازماتِ محبت اور تعلقاتِ خوف کو پورا کر سکے گا جو آپ کے ساتھ تعلق میں ضروری ہیں اس لئے ہم آپ سے ہی مدد مانگتے ہیں کہ اس تعلق کو نباہنے کی ہمیں طاقت دے۔ غرض ان مختصر الفاظ میں خدائے تعالیٰ کے حسن اور احسان اور اس کے جلال کا ایسا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ کسی ملک کسی قوم کسی تہذیب اور کسی زمانہ کے لوگ اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہر ایک انسان جب اللہ تعالیٰ کی صفات کا مطالعہ ان آیات پر نظر ڈال کر کرتا ہے جو ابھی بیان ہوئیں تو اس کا قلب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

خوف کے تعلق کو کامل بنانے کا طریق

اس جگہ ضمنی طور پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ گو خوف بھی ایک ذریعہ تعلق ہے لیکن یہ ذریعہ تعلق نہایت ادنیٰ ہے کیونکہ خوف کا تعلق حقیقی تعلق نہیں ہوتا مگر اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض طبائع خوف کے بغیر تعلق پیدا نہیں کرتیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے پس اس تعلق کو کامل کرنے کا بھی ایک طریق قرآن کریم نے بتایا ہے اور خوف سے تعلق پیدا کرنا صرف ابتدائی ذریعہ رکھا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بچے جب سکول نہیں جاتے یا اور بعض فرائض ادا نہیں کرتے تو ان کے والدین جب معلوم کر لیتے ہیں کہ ہماری محبت اور ہمارا احسان ان کی بگڑی ہوئی طبیعت کی اصلاح نہیں کر سکتے تو وہ سختی سے کام لے کر ان کو مدرسہ بھیجتے ہیں اور کچھ مدت تک تو وہ اس ڈر اور خوف سے جو ان کے والدین ان کے دل میں پیدا کرتے ہیں مدرسہ جاتے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی مہربان مدرس ہو تو وہ چند ہی دنوں میں ان کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کر لیتا ہے اور پھر وہ خوف مبدل بہ محبت ہو جاتا ہے اور گو ان کے سکول میں جانے کی ابتداء خوف سے ہوئی تھی لیکن بعد میں خوف کی جگہ محبت اور ڈر کی جگہ پیار لیتا ہے اور اس طرح ان ناقص نتائج کا جو ایسی تعلیم سے نکلنے تھے جس کا محرک صرف خوف تھا اندیشہ جاتا رہتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح خدائے تعالیٰ بھی اپنے بندے سے سلوک کرتا ہے اور گو تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے اور ان طبائع کو ہلاکت سے بچانے کیلئے جو بعض کمزوریوں کی وجہ سے ایسی مسخ ہو جاتی ہیں کہ صرف خوف سے ہی قریب آسکتی ہیں۔ اس شہنشاہ ارض و سماء کا جلال اور اس کی گرفت کی سختی بھی انسان کو یاد کرائی گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف : ۱۵۷) میری رحمت اور میری بخشش ہر ایک چیز پر

حاوی ہے اب اس آیت کے مضمون کو اس آیت کے مضمون سے ملا کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ خوف صرف ایک ابتدائی ذریعہ رکھا گیا ہے ورنہ جب کوئی شخص خوف سے اللہ تعالیٰ کی طرف آتا ہے تو وہ اپنی رحمت کی اس قدر بارش اس پر کرتا ہے اور اپنے افضال کے اتنے چھینٹے اسے دیتا ہے کہ گو اس کا بندہ اپنے تعلق کی بناء خوف پر ہی رکھے جاتا ہے لیکن آخر اس کے دل کی سختی دور ہو جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ پہلے خدائے تعالیٰ کے احسان اور پھر اس کے حسن کا ادراک اپنے دل میں پاتا ہے اور خوف کا تعلق محبت کے تعلق سے بدل جاتا ہے اور اس کا دل خدائے تعالیٰ کے خوف سے پُر ہونے کی بجائے اس کی رحمت کی یاد سے پُر ہو جاتا ہے اور آخر رحمت ہی رحمت رہ جاتی ہے اور محبت ہی محبت جلوہ گر ہو جاتی ہے اور اگر خوف باقی رہتا ہے تو صرف اس بات کا کہ کہیں کسی فعل کی وجہ سے اس محبوب یکتا سے جدائی نہ ہو جائے۔

تعلق باللہ کے لئے جس تدبیر سے اسلام نے کام لیا ہے دوسرے مذاہب اس کی نظیر لانے سے قاصر ہیں

یہ مضمون جو اوپر بیان ہُوا ہے۔ ان تدابیر کو ظاہر کرتا ہے جو اسلام نے اللہ تعالیٰ سے بندے کا تعلق پیدا کرنے اور پھر اسے مضبوط کرنے کیلئے کی ہیں اور ہر ایک شخص ایک ذرا سے غور سے معلوم کر سکتا ہے کہ کس طرح ان تدابیر میں میانہ روی سے کام لیا گیا ہے اور تمام وہ پہلو مدِّنظر رکھے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کا تعلق خدائے تعالیٰ سے قائم ہو سکتا ہے لیکن اس مقابلہ میں جو تعلیم دوسرے مذاہب نے پیش کی ہے وہ ایسی وسیع اور تمام طبائع کے مطابق نہیں مثلاً یہودیت نے خدائے تعالیٰ کو نہایت ہیبت ناک شکل میں پیش کیا ہے اور اس کی غضب اور انتقام کی خواہش پر بہت زور دیا ہے جس کی یہ وجہ تھی کہ بنی اسرائیل فرعون کی ماتحتی میں رہ کر جو ایک ظالم بادشاہ تھا اس بات کے عادی ہو گئے تھے کہ خوف اور ظلم سے ہی بات مانتے تھے پس ان پر خدائے تعالیٰ کا جلوہ گرجوں اور زلزلوں کے رنگ میں ہُوا لیکن آہستہ آہستہ ان کی طبیعت کی اصلاح ہو گئی اور کچھ مدت کے بعد تو ان خیالات نے ان پر حد سے زیادہ تصرف کر لیا۔ پس ضرورت تھی کہ اس وقت کے حالات کے ماتحت حضرت مسیحؑ محبت کا پیام لاتے اور روح القدس کبوتری جیسے نرم طبیعت اور حلیم جانور کی شکل میں ظاہر ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور دیا جاتا تا ان غلط خیالات کی اصلاح ہو جو خدائے تعالیٰ کی سخت گیری اور منتقم طبیعت کے متعلق ان کے اندر پھیل گئے تھے چنانچہ اس وقت کے نقص کا علاج اسی

طرح کیا گیا لیکن جب ایک مدت کے بعد مسیحیوں کا میلان بالکل دوسری طرف ہوگیا اور وہ اعمال سے غافل ہونے لگے تو پھر ایک اور شریعت کی ضرورت ہوئی اور یہی حال دیگر مذاہب کا ہے کہ ان میں سے کسی مذہب میں ضرور تاً خدائے تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی صفات پر زور دیا گیا ہے اور کسی میں اس کی محبت اور پیار پر اور چونکہ یہ تمام تعلیمیں وقتی تھیں جب حالات بدل گئے تو بجائے نفع رسانی کے نقصان دہ ہوگئیں اور اب چونکہ وہ وقت آگیا تھا جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے ایک کامل اور عالمگیر مذہب کیلئے پسند فرمایا تھا اس لئے نبیوں کے سردار اور نیکوں کے پیشوا محمد ﷺ پر وہ وحی نازل کی گئی جو ایسی جامع اور مانع تھی کہ کسی طبیعت اور کسی تعلیم اور کسی تہذیب کے آدمیوں کی ضرورت اس میں نظرانداز نہیں کی گئی اور نہ کوئی غیر ضروری اور وقتی بات اس میں داخل کی گئی۔ پس ہم ان نادانوں کی طرح جو اپنے خُبث کا اظہار خدائے تعالیٰ کے پاک بندوں کو گالیاں دے کر کرتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ اسلام سے پہلے کے سب مذاہب جھوٹے تھے بلکہ ہم ان کو سچا تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں واقعات اور حق کی محبت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ جو جامعیت اسلام میں ہے وہ کسی مذہب میں نہیں اور یہ کہ اسلام کے آنے کے بعد اب اور کسی مذہب کی ضرورت نہیں۔ ان مذاہب نے خدائے تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں وہ اپنے وقت کے مطابق درست تھیں لیکن اب اس زمانہ میں جبکہ تمدن کی ترقی نے سب دنیا کو ایک کر دیا ہے اور انسانی علوم بہت ترقی کر چکے ہیں وہ انسان کی ہدایت کیلئے کافی نہیں ہو سکتیں اور اس وقت اسلام ہی ہے جو اپنی بے عیب تعلیم کی وجہ سے تمام دنیا کی ہدایت کر سکتا ہے اور جس کی تعلیم کسی خاص بات پر زور نہیں دیتی بلکہ تمام ضروری ہدایتوں کو کھولتی اور شرح کرتی ہے۔ مختلف مذاہب اپنے اندر مختلف صداقتیں رکھتے ہیں لیکن کوئی ایسا مذہب نہیں جو یکجائی طور پر ان تمام خوبیوں کا جامع ہو جو اسلام کے اندر پائی جاتی ہیں پس آج روئے زمین پر سوائے اسلام کے اور کوئی ایسا مذہب نہیں جو انسان کا تعلق خدائے تعالیٰ سے پیدا کرا سکے اور اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے کامل شریعت بھیج دی ہے تو اس نے اپنی رضا کے اظہار کے لئے اسلام کے سوا اور تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور کوئی شخص اب خدائے تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اسلام کا جُوا اپنی گردن پر نہ اٹھائے۔ افسوس ہے کہ قلت وقت کی وجہ سے اس موضوع پر بالتفصیل بحث نہیں ہو سکتی ورنہ اور بہت سی مثالوں کے ساتھ بتایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے

لئے اسلام نے کونسی ایسی تدابیر اختیار کی ہیں کہ جن کی نظیر لانے سے اور سب مذاہب قاصر ہیں۔

دوسرا حصہ شفقت علیٰ خلق اللہ

جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں اللہ تعالیٰ سے بندے کا تعلق قائم کرنے کے علاوہ مذہب کا ایک اور بھی کام ہے اور وہ اپنے پیروان کو شفقت علیٰ خلق اللہ کی تعلیم دیتا ہے چنانچہ پہلے حصہ سے فارغ ہو کر میں اس کے متعلق اسلام کی تعلیم بیان کرتا ہوں۔ شفقت علیٰ خلق اللہ کے مضمون کے بڑے بڑے حصے تین ہیں اول انسان کا معاملہ اپنے نفس سے۔ دوم انسان کا معاملہ دوسرے انسانوں سے۔ سوم انسان کا معاملہ دوسرے حیوانوں سے چنانچہ ان تینوں حصوں میں سے سب سے پہلے میں اس مضمون پر کچھ بیان کرتا ہوں کہ اسلام نے انسان کو اپنے نفس کے ساتھ کیسا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

انسان کا معاملہ اپنے نفس سے

مختلف مذاہب نے بنی نوع انسان کے آپس کے سلوک کے متعلق تو بہت کچھ کہا ہے لیکن اس کے متعلق کہ انسان کو اپنے نفس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے بہت کم مذاہب میں کوئی تعلیم پائی جائے گی سوائے اسلام کے کہ اس نے اس امر پر بھی نہایت تشریح کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور علاوہ ان روحانی طریقوں کے بتانے کے جن کے ذریعہ انسان خدائے تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے انسان کو اس بات کی طرف بھی متوجہ فرمایا ہے کہ اسے اپنے نفس کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہئے اور یہ معاملہ ایسا ضروری اور زبردست ہے کہ اس پر روشنی ڈالے بغیر کوئی مذہب کامل نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک انسان کو یہ نہ بتایا جائے کہ وہ اپنے نفس سے کیسا معاملہ کرے تب تک اس کی کامل طور پر اصلاح نہیں ہو سکتی کیونکہ جسم کا روح پر بڑا اثر پڑتا ہے اور جسم کی مختلف حالتوں سے روح متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی شخص کے جسم پر چوٹ آئے تو اس کی روح کو بھی اس سے سخت صدمہ پہنچتا ہے اور انسان کا دل مغموم ہو جاتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سخت چوٹ سے انسان کے حواس میں فرق آجاتا ہے اور کبھی سخت غم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدن گھلنے لگتا ہے اور انسان چند گھنٹوں کے اندر ضعیف ہو جاتا ہے چنانچہ

ایسے بہت سے واقعات ہوئے ہیں کہ کسی شخص کو کوئی سخت صدمہ پہنچا تو چند گھنٹوں یا چند دنوں کے اندر اس کے بال سفید ہو گئے۔ غرض ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جسم و روح کو خدائے تعالیٰ نے ایسا ایک دوسرے سے پیوستہ کیا ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر فوراً پڑتا ہے پس جب کہ جسم و روح کے قرب کی یہ حالت ہے تو ضرور ہے کہ جو حالت جسم کی ہوگی وہی حالت روحانی ترقیات کی ہوگی اور جو مذہب کہ انسان کو یہ نہیں بتاتا کہ اسے اپنے جسم کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہئے وہ درحقیقت انسان کو منجدھار دیتا ہے کہ تا ہلاک ہو اور جو مذہب اس کے متعلق ادھوری تعلیم دیتا ہے وہ بھی کسی خاص حالت میں تو درست ہو سکتی ہے لیکن ہر انسان کے لئے نہیں بلکہ اغلب ہے کہ بہتوں کی ہلاکت کا باعث ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مذاہب کی یہ تعلیم ہے کہ جسم کو جس قدر بھی دکھ دیا جائے اسی قدر روحانیت میں ترقی ہوتی ہے۔ اس تعلیم کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ان کے پیروان اپنے پورے زور سے اپنی جسمانی طاقتوں کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے ذرائع استعمال کرتے ہیں کہ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے جسم کو بالکل تباہ کر دیں چنانچہ بعض لوگ گرمی کے دنوں میں ہر وقت آگ کا آلاؤ لگا کر اس کے اندر بیٹھے رہتے ہیں اور اس طرح اپنے جسم کی تمام طاقتوں کو اپنے ہاتھوں سے زائل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سردی میں ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہتے ہیں۔ بعض سورج کے نکلتے ہی اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر کھڑے رہتے ہیں اور اس طرح اس منور دن کو جو خدائے تعالیٰ نے کام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے ضائع کر دیتے ہیں بعض ہر وقت ٹانگیں اوپر کر کے اور سر نیچے کر کے لٹکے رہتے ہیں اور اسی کو بڑی خوبی خیال کرتے ہیں۔ بعض اپنے آپ کو خصی کرا کے انسانیت کے دائرہ سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بعض نفس کشی کے نام سے ہر قسم کی طیبات سے پرہیز کرتے ہیں اور کُل لطیف غذائیں ترک کر دیتے ہیں اور اگر کوئی لطیف شئے کھاتے بھی ہیں تو اس کے اندر کچھ ایسی چیز ملا دیتے ہیں جیسے راکھ وغیرہ اور اس طرح اپنا نفس مارتے ہیں بعض لوگ ہر وقت خاموش رہتے ہیں اور اس طرح خدائے تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض نجاستیں کھا لیتے ہیں۔ بعض مردہ انسان کا گوشت کھاتے ہیں۔ بعض ہر روز روزہ رکھتے ہیں۔ بعض لوگ یہ نیت کر لیتے ہیں کہ ساری عمر شادی نہیں کریں گے اور بہت سے مرد اور عورتیں اپنی عمریں اسی طرح گزار دیتے ہیں۔ بعض لوگ نہانا اور ناخن کتروانا وغیرہ صفائی کے کام چھوڑ دیتے ہیں غرض اس قسم کے سینکڑوں کام ہیں جو مختلف مذاہب میں بتائے گئے ہیں اور انہیں پسند کیا جاتا

ہے اور ان کے کرنے والوں کو خدائے تعالیٰ کا برگزیدہ اور پیارا انسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن در حقیقت یہ ایک ظلم ہے جو یہ لوگ اپنی جان سے کرتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں جبکہ خدائے تعالیٰ نے ہاتھ پکڑنے کیلئے اور زبان بولنے کیلئے اور آنکھیں دیکھنے کیلئے اور پاؤں چلنے کیلئے دیئے ہیں اور یہ اعضاء اس کے انعامات میں سے ہیں۔ تو کیسا قابل ملامت ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کو ضائع کر دیتا ہے اور ان کی قدر نہیں کرتا۔ ایسا شخص تو اللہ تعالیٰ کی ہتک کرتا ہے کیونکہ اس کی دی ہوئی نعمت کو حقارت سے پھینک دیتا ہے کہ میں نہیں لیتا اور خود اپنے نفس پر بھی ظلم ہے کہ اسے بے وجہ اور بے فائدہ ایسی تکالیف دی جاتی ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح جو لوگ ساری عمر بغیر شادی کے رہنے کا عہد کرتے ہیں یا ان طاقتوں کو ضائع کر دیتے جن سے نسل انسانی چلتی ہے وہ اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں کہ انہیں ان پاک جذبات سے روکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر رکھے تھے ایسے فعل کبھی خدائے تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتے کیونکہ جو اس کی نعمت کو رد کرتا ہے وہ کبھی اس کا پسندیدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو لوگ طیبات کو چھوڑ دیتے ہیں یا نجاستوں کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی اپنے نفس پر ایسا ظلم کرتے ہیں کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں اور یہ سب لوگ اپنے آپ کو ایسے حالات میں ڈال دیتے ہیں کہ جن سے اکثر بجائے شیطان سے بچنے کے وہ شیطان کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں کیونکہ جو شخص اپنے جسم کو سخت صدمہ پہنچاتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی روح کو بھی اس سے صدمہ پہنچ جائے گا اور یا تو اس کے دماغ میں بلادت پیدا ہو جائے گی کہ وہ باریک مسائل کو سمجھ ہی نہیں سکے گا اور یا جنون کا کوئی شعبہ اس کے اندر پیدا ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ ان انعامات سے قطعی محروم ہو جائے گا جو خدائے تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کے لئے مقرر ہیں۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ کے جس قدر برگزیدے دنیا میں گزرے ہیں ان کی نسبت صحیح تواریخ سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک نے بھی اپنی طاقتوں کو اس طرح ضائع کر دیا ہو۔ ہاں ممکن ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کے اندر جذبات کا سخت جوش دیکھ کر ان کے جوش کے کم کرنے کی وقتی ضرورت دیکھ کر ان کو بعض ایسی سخت ریاضتیں کرنے کا حکم دے دیا ہو؟ لیکن ایک عالمگیر مذہب میں کسی ایسی تعلیم کا گزر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس تعلیم کا پھیلانا نوع انسان کو ان تمام ترقیات سے محروم کر دینا ہے جو وہ ان علوم کے ذریعہ سے کر رہی ہے جو خدائے تعالیٰ نے اسے عنایت فرمائے ہیں۔ ذرا

خیال تو کرو کہ اگر کسی ملک کے سب لوگ سب کچھ چھوڑ کر درختوں میں رسیاں ڈال کر الٹے لٹکنے لگ جائیں یا جنگل کاٹ کاٹ کر اپنے اردگرد آگ کے الاؤ لگا کر سب اس کے اندر بیٹھ جائیں یا سب مرد و عورت یہ عہد کرلیں کہ فلاں او تاریا نبی کی خاطر ساری عمر مجرد رہیں گے اور نکاح نہ کریں گے تو اس قوم یا اس ملک کا کیا حشر ہوگا۔ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ چند ہی سال میں وہ ملک برباد ہو جائے گا اور انسان کی بجائے درندے اسکے شہروں میں بسیرا کریں گے اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایسے جذبات نہ رکھے ہوئے ہوتے جو انسان کو ان ریاضتوں سے روکتے ہیں تو شاید بہت سی قومیں ایسے تجربوں کے ذریعہ ہلاک ہو جاتیں مگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی حفاظت کیلئے خود ان کے اندر ہی ایسے سامان پیدا کر دیئے ہیں جو اکثروں کو ہلاک ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

علاوہ اس کے کہ انسان کا اپنے نفس سے وہ معاملہ کرنا جو اوپر بیان ہُوا ایک ظلم عظیم ہے اور سوسائٹی کے حقوق کا اتلاف ہے بلکہ خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا رد کرنا ہے۔ اس قسم کی ریاضتوں کا یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ نفس انسانی ایسا کمزور ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر بد خیالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہتی چنانچہ یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ جب انسان کمزور ہو جاتا ہے تو وہ اپنے خیالات و توہمات کا جلد شکار ہو جاتا ہے پس ایسی ریاضتوں کے ذریعہ سے جسم کی طاقت کو توڑ دینے کا نتیجہ بہت دفعہ یہی نکلتا ہے کہ انسان بجائے گناہ سے بچنے کے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جس اژدہا سے بھاگنا چاہتا تھا اسی کے مونہہ میں چلا جاتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو ان نعماء سے بکلی روکنا چاہتے ہیں جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے استعمال کے لئے پیدا کی ہیں وہ حلال ذرائع سے تو محروم ہو جاتے ہیں لیکن بہت دفعہ اپنے طبعی جوشوں سے مغلوب ہو کر حرام خوری اور حرام کاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ غرض انسان کا اپنے جسم کو سخت مشقتوں میں ڈالنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے اور اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور ان قیمتی طاقتوں کا ضائع کرنا ہے جو خدائے تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اسے دین و دنیا کی ترقی کے لئے عطا فرمائی تھیں۔ پس جو مذہب اپنے پیروؤں کو اس قسم کی تعلیم دیتا ہے وہ تفریط سے کام لیتا ہے اور نفس کے حقوق کو بلا وجہ روک کر اسے ہلاکت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے اور ایسا مذہب کسی خاص وقت میں کسی خاص قوم کے لئے تو ممکن ہے کہ مفید ہو لیکن دنیا کی ہدایت کے لئے وہ ہرگز کار آمد نہیں ہو سکتا۔

اس تفریط کے مقابلہ میں بعض مذاہب نے افراط سے کام لیا ہے اور انہوں نے جسمانی ریاضتوں کو سرے سے ہی مضر اور لغو قرار دیا ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ جسم کو کسی ریاضت میں ڈالنا بالکل لغو اور فضول ہے اور اس میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ کو کسی انسان کو تکلیف دینے یا اسے بھوکا پیاسا رکھنے سے کیا سروکار ہے اور اس عذر کے ماتحت انہوں نے تمام عبادات کو ترک کر دیا ہے۔ لیکن جس طرح ان مذاہب نے جنہوں نے نفس کو بلاوجہ دکھ میں ڈالنے اور تمام لذائذ و نعماء سے بچنے کی ترغیب دی ہے نفس کے حق میں تفریط سے کام لیا ہے اسی طرح اس جماعت نے اس کے حق کی ادائیگی میں افراط سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ طرح طرح کی دنیاوی لذتوں کے حصول میں مشغول رہتے ہیں اور ہر وقت اپنے جسم کی تربیت میں مشغول رہتے ہیں ان کا جسم اسقدر آرام طلب ہو جاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں روح بھی سست ہو جاتی ہے اور ایسے لوگوں کا رفتہ رفتہ قلب بھی سیاہ ہو جاتا ہے کیونکہ جسم انسان کی روح کے ساتھ وہی تعلق رکھتا ہے جو کہ ایک میوہ کا قشر اس کے مغز سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قشر خود مطلوب نہیں لیکن قشر کو جب مغز سے جدا کر دو گے تو وہ فوراً یا کچھ دیر کے بعد بالکل برباد ہو جائے گا اسی طرح اگر عبادات میں جسم کو بھی شامل نہ کیا جائے تو ایسی عبادات جلد فنا ہو جاتی ہیں اور ایسے لوگ جو عبادت کا تعلق صرف قلب کے متعلق سمجھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف دل کی عبادت کافی ہے کچھ دنوں کے بعد دلی عبادت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی روح کی تازگی جاتی رہتی ہے اور سستی اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ اس طرح مرجھائی جاتی ہے جس طرح قشر سے الگ کیا ہؤا مغز۔ اور اس بات کو اگر نظرانداز بھی کر دیا جائے تب بھی اس بات میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ جس طرح انسان کی روح خدائے تعالیٰ کے احسان کے نیچے ہے اسی طرح اس کا جسم بھی ہے۔ پس روح اور جسم دونوں کو عبادت میں لگانا ہی انسان کو اس شکر گزاری کے فرض سے سبکدوش کر سکتا ہے جس کا بجالانا اس کے لئے نہایت ضروری ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کا جسم مثل ایک سواری کے گھوڑے کے ہے جس پر سوار ہو کر انسان اس زندگی کے سفر کو طے کرتا ہے اور اس کو جب تک ایسی حالت میں نہ رکھا جائے جس سے ایک تو یہ چست و چالاک ہو جائے اور دوسری طرف ایسے دُبلاپن سے محفوظ رہے کہ جس کا نتیجہ ہلاکت ہو تب تک کبھی انسان اپنے سفر زندگی کو عمدگی سے طے نہیں کر سکتا۔ کیا نہیں دیکھتے

کہ ہوشیار آقا کس طرح اپنے گھوڑے کو ایسا موٹا اور فربہ ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ سفر کے ناقابل ہو جائے اسی طرح وہ اسے ایسا دبلا ہونے سے بھی بچاتا ہے کہ جس کا نتیجہ اس کی ہلاکت ہو۔یہی حال جسم کا ہے جب تک اس کے متعلق دونوں باتوں کا خیال نہ رکھا جائے انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا یعنی ایک طرف تو اس سے اس قدر ریاضت لی جائے کہ وہ بالکل دنیا کی طرف نہ جھک جائے اور ضرورت کے وقت خدائے تعالیٰ کے حکم کو بجالانے سے قاصر رہے اور دوسری طرف اسے اس قدر کمزور نہ کر دیا جائے کہ وہ اپنے دنیاوی فرائض سے بھی معذور ہو جائے اور قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے اور اپنی کمزور حالت سے روح کو بھی صدمہ پہنچائے پس جو مذہب انسان کو اپنے نفس سے اس قسم کا سلوک کرنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ یا وہ تفریط کی طرف چلا جاتا ہے یا افراط کی طرف وہ مذہب کامل نہیں کہلا سکتا اور نہ تمام دنیا کے لئے ایسا مذہب قابل عمل ہو سکتا ہے۔اور وہی مذہب تمام دنیا کے لئے قابل عمل ہو سکتا ہے جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے والا ہو اور انسان کو ایسے راستہ پر چلائے جس پر چل کر وہ آسانی سے خدائے تعالیٰ تک پہنچ جائے اور باوجود اس بات کا اقرار کرنے کے کہ تمام مذاہب خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہی آئے ہیں میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر کوئی مذہب اس مسئلہ پر کہ انسان کو اپنے نفس کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہئے تمام پہلوؤں کو مدِّنظر رکھ کر اور کل طبائع کا خیال رکھ کر روشنی ڈالتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔ وہی ہے جو ایک طرف تو ایسے لوگوں کا خیال رکھتا ہے جو جسم کے نحیف اور صحت کے کمزور ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان لوگوں کا علاج کرتا ہے جو اپنے جسم کی فربہی کی فکر میں اپنی روح کو بالکل بھلا دیتے ہیں چنانچہ قرآن کریم ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر اس بارہ میں کہ انسان کو اپنے نفس سے کیسا معاملہ کرنا چاہئے یوں فرماتا ہے کہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ - (البقرة: ۱۹۶) یعنی تم لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالا کرو یعنی عبادات میں یا کھانے پینے میں یا محنت و مشقت میں یا صفائی و طہارت میں کبھی کوئی ایسی راہ نہ اختیار کرو جس کا نتیجہ تمہاری صحت یا تمہاری عقل یا تمہارے اخلاق کے حق میں برا نکلے۔ تَهْلُكَةِ کا لفظ جو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے اس کے معنے کسی ایسے فعل کے ہوتے ہیں جس کا انجام ہلاکت ہو اس لفظ کے استعمال کرنے میں ایک بہت بڑی حکمت ہے اور وہ یہ کہ تَهْلُكَة کے اصل معنے ایسا کام کرنے کے ہیں جس کا نتیجہ برا نکلے۔ پس اس لفظ کے

استعمال کرنے سے قرآن کریم نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اسلام دین یا عزت یا تمدن کی حفاظت کے لئے انسان کو اپنی جان خطرہ میں ڈال دینے سے نہیں روکتا بلکہ ایسے کاموں سے روکتا ہے جن کا کوئی نیک نتیجہ بر آمد ہونے کی امید نہ ہو اور جن میں انسان کی جان یا کسی اور مفید شئے کے بلاوجہ برباد ہونے کا خطرہ ہو- یہ تو ایک عام حکم ہے جس میں اصولاً انسان کو بتایا گیا ہے کہ اسے اپنے نفس سے کیسا معاملہ کرنا چاہئے لیکن اس کے علاوہ قرآن کریم و احادیث میں اس کے متعلق بہت سی تفاصیل بھی پائی جاتی ہیں چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ انسان کے کھانے اور پینے کے متعلق فرماتا ہے يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۔ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔ (المائدۃ : ۵) یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کو کون کونسی اشیاء کھانے کی اجازت ہے تو اس کے جواب میں کہہ دے کہ ہر ایک چیز جو تمہارے جسم یا تمہاری عقل یا تمہارے اخلاق یا تمہارے دین کے لئے مضر نہیں وہ تمہارے لئے حلال ہے بے شک اس کا استعمال کرو- اسی طرح ایک دوسری جگہ فرماتا ہے کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ (المائدۃ : ۸۸) یعنی اے مؤمنو! جو پاک اشیاء (جو کسی طرح بھی تمہارے لئے مضر نہیں) حلال کی گئی ہیں ان کو اپنے نفس پر کبھی حرام نہ کرو یعنی کبھی اپنے نفس سے عہد نہ کرو کہ فلاں چیز جو صحت بدن و سلامتی عقل و درستی اخلاق و حفاظت دین میں سے کسی شئے کے لئے بھی مضر نہیں صرف نفس کشی کے لئے ہم اپنے نفس پر حرام کرتے ہیں- اور اس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر ایک طرف تم کو ان چیزوں کو اپنے نفس پر حرام کرنے کی اجازت نہیں تو دوسری طرف اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ تم اپنے نفس کو بس کھانے پینے ہی میں لگا دو اور دیگر فرائض کو بھول جاؤ- اگر ایسا کرو گے تو یہ فعل تمہارا حد سے نکلا ہوا ہو گا اور اللہ تعالیٰ حد سے بڑھ جانے اور ایک طرف ہی جھک جانے کو ہرگز پسند نہیں کرتا- اس آیت پر غور کرو کہ کھانے پینے کے متعلق کس طرح ایک طرف تو بلاوجہ اپنے نفس کو طیب اور پاک اشیاء سے محروم رکھنے سے منع کیا ہے اور دوسری طرف بالکل جسم کی پرورش میں ہی مشغول ہو جانے سے روکا ہے- کیا یہی وہ تعلیم نہیں کہ جو ہر ایک طبیعت اور ہر ایک ملک اور ہر ایک زمانہ اور ہر ایک ضعیف یا قوی انسان کے مناسب حال ہے پھر کیا اسلام کے سوا کوئی اور بھی مذہب ہے جس نے اس رنگ میں انسان کی ہدایت کی ہو- اگر نہیں تو کیا اس امر سے یہ بات پوری طرح ثابت نہیں ہو جاتی کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اس وقت

خدائے تعالیٰ تک انسان کو پہنچا سکتا ہے اور جس کی تعلیم تمام بنی نوع انسان کو ہدایت دے سکتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے علاوہ ایک اور آیت بھی کھانے پینے کے متعلق قرآن کریم میں آتی ہے اور وہ یہ ہے وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ (الاعراف : ۳۲) یعنی کھاؤ اور پیو لیکن کھانے اور پینے میں اسراف نہ کرو یعنی ایسا نہ ہو کہ اپنی زندگی عمدہ کھانوں اور ٹھنڈے شربتوں کے لئے وقف کر دو بلکہ ضرورت کے مطابق ہر طیب چیز بے شک استعمال کرو۔ کھانے پینے اور باقی زینت اور آرام کی اشیاء کے لئے جو انسان اپنے آرام کے لئے استعمال کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف : ۳۳) یعنی کہہ کہ کس نے حرام کی ہیں وہ زینت کی اشیاء جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اسی طرح کس نے طیب رزق حرام کئے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے کچھ اشیاء بطور زینت پیدا کی ہیں تو پھر کس کی طاقت ہے کہ ان اشیاء کو کوئی استعمال نہ کرے اگر ان کا استعمال کرنا ناجائز تھا تو پھر خدائے تعالیٰ نے انہیں پیدا کیوں کیا؟

اسی طرح عبادت کے متعلق رسول کریم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے کہ اتنی عبادت کرو جس پر نفس راضی ہو اور جب نفس میں ملال پیدا ہونے لگے اسی وقت چھوڑ دو اور آپ کی نسبت یہ روایت ہے کہ آپ ایک دفعہ مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں ایک رسی لٹکی ہوئی دیکھی۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ کیسی رسی ہے تو لوگوں نے جواب دیا کہ ام المؤمنین زینبؓ نے اس لئے لٹکوائی ہے کہ جب وہ نماز میں مشغول ہوتی ہیں تو کبھی سخت نیند آئے تو اس پر سہارا لے لیتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اس رسی کو ابھی کھول دو۔ (بخاری کتاب التهجد باب ما یکره من التشدید فی العبادة) ایسی عبادت کی اجازت نہیں۔ اسی طرح روزوں کے متعلق عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ انہوں نے کہا ہے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا تو اس پر آپ نے ان کو بلا کر فرمایا کہ یہ درست نہیں اور آخر ان کے بہت اصرار کرنے پر اس بات کی اجازت دی کہ ایک دن روزہ رکھ لیں اور ایک دن افطار کریں اور جب انہوں نے کہا کہ میں اس سے بھی بہتر روزوں کی طاقت رکھتا ہوں یعنی میں اس سے زیادہ برداشت کر سکتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ اس سے بہتر کوئی روزہ نہیں یعنی اگر اس سے زیادہ کوئی انسان رکھے گا تو اس کی صحت کو صدمہ پہنچے گا اور نتیجہ اچھا نہ نکلے گا۔ غرض آپ نے آخر میں یہ کہہ کر ان کو رخصت کیا کہ اے عبداللہ تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھ کا

بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ (بخاری کتاب الصیام باب صوم الدھر)

اسی طرح جسم کے بعض اعضاء کے ضائع کرنے کی نسبت حدیث میں آتا ہے کہ جب بعض صحابہؓ نے ساری عمر مجرد رہنے کیلئے یہ تجویز کی کہ وہ اپنے آپ کو خصی کرلیں تو رسول کریم ﷺ نے ان کو منع فرمایا اور شادی نہ کرنے کے خیال کو بھی رسول کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ لَا رَهْبَانِيَةَ فِى الْإِسْلَامِ (المبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۱) اسلام میں رہبانیت نہیں یعنی اسلام مسیحیوں کی طرح مانکس (Monks) اور ننز (Nuns) بننے کی اجازت نہیں دیتا۔

پچھلے تمام حوالہ جات سے آپ لوگوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام نے کس طرح شفقت علیٰ خلق اللہ کے اس حصہ کے متعلق بھی کامل اور مکمل تعلیم دی ہے اور کس طرح افراط و تفریط سے اجتناب کر کے میانہ روی کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے اور ایسے احکام دیئے ہیں جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں جاری ہو سکتے ہیں اور اگر ایک طرف جسم انسانی کو روح کا شریک حال کرنے کے لئے بلکہ روحانی طاقت کو بڑھانے کے لئے جسم کو بھی ریاضت اور عبادت میں شریک کیا ہے تو دوسری طرف اس کی تربیت کی ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور اسلام نے تو یہاں تک صحت انسانی کا خیال رکھا ہے کہ ان مختصر سی عبادات میں بھی جو مسلمانوں کے لئے مقرر کی ہیں بیماری اور سفر کی حالت میں بہت کچھ سہولت رکھ دی ہے تاکہ کسی انسان پر وہ بوجھ نہ ہوں اور کسی کی طبعی قوتیں اور استعدادیں اس سے تباہ نہ ہو جائیں۔ پس اس حصہ شریعت کے متعلق بھی صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ایسی کامل تعلیم پیش کرتا ہے جس پر تمام دنیا کے انسان عمل کر سکتے ہیں۔

دوسرے انسانوں سے سلوک

دوسرا حصہ شفقت علیٰ خلق اللہ کا وہ تعلیم ہوتی ہے جو کسی مذہب نے اپنے پیروؤں کو اپنے سوا دوسرے بنی نوع انسان سے سلوک کے متعلق دی ہوتی ہے۔ پس پہلے حصہ سے فارغ ہو کر ہم اس حصہ کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں تا معلوم ہو کہ اس میدان میں بھی اسلام ہی دیگر ادیان پر غالب ہے مگر پیشتر اس کے کہ اس حصہ کے متعلق ہم کچھ تفصیل وار بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان سے سلوک کرنے کے متعلق جو تعلیم اجمالی طور پر قرآن کریم میں مذکور ہے پہلے بیان کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ

وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ۚ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۔ (النحل : ۹۱) یعنی اللہ تعالیٰ تم کو عدل اور احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کا حکم دیتا ہے اور تم کو فحشاء اور منکر اور بغاوت سے روکتا ہے وہ تمہیں اس لئے نصیحت کرتا ہے تا تم اپنی اصلاح کر لو۔ اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے ہر ایک مسلمان کو تین باتوں کا حکم دیا ہے اور تین باتوں سے روکا ہے۔ گویا ایک حکم کے مقابلہ میں ایک نہی ہے اور ہر ایک نیکی جس کے کرنے کا حکم دیا ہے اس کے مقابل کی بدی کو بھی بیان کر دیا ہے کہ اس سے تم کو بچنا چاہئے۔ پہلا زینہ جس پر ایک مؤمن کو چڑھنے کا حکم دیا ہے وہ عدل کا زینہ ہے یعنی کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ اگر کسی کے ہاں ملازم ہے تو اس کا کام دیانت سے کرے جتنی تنخواہ لیتا ہے اس کے مطابق حسب معاہدہ کام بھی کرے اگر مزدور ہے تو محنت سے اپنا وقت اس شخص کے کام میں صرف کرے جس نے اس کو لگایا ہے اگر کسی کا کوئی روپیہ دینا ہے تو اسے ادا کرے اگر کسی کا کوئی اور حق ادا کرنا ہے تو دیانت سے ادا کرے۔ غرض اپنے ہر ایک فعل میں عدل سے کام لے اور کسی کی حق تلفی نہ کرے پورا پورا حق ادا کر دے۔ اس کے بعد فرمایا کہ عدل کے زینہ پر جب مؤمن چڑھ جائے تو پھر اسے چاہئے کہ احسان کے زینہ پر قدم رکھے یعنی نہ صرف اسے اس بات کا خیال رہے کہ میں ہر ایک شخص کے حقوق پورے پورے ادا کر دوں بلکہ اب اس کی ایمانی حالت اس درجہ تک ترقی پا جائے کہ وہ لوگوں کے حقوق ادا کر کے اپنی طرف سے بھی کچھ بطور احسان ان کو دے اور لوگوں کے ساتھ عدل کرنا تو اس کے لئے ایسا ہو جائے جیسے ایک معمولی بات ہے اور اس کو اب اسی بات کی فکر رہے کہ میں اپنی طاقت' اپنی قوت' اپنے مال' اپنی دولت' اپنی عزت' اپنی وجاہت سے کس طرح لوگوں کو فائدہ پہنچاؤں اور جب وہ اس درجہ کو بھی پالے تو ایک مسلمان کو چاہئے کہ اس سے بھی بلند ہو اور احسان کرنا بھی اس کی نظر میں ادنیٰ ہو جائے اور وہ ایتاء ذی القربیٰ کا درجہ حاصل کر کے جو احسان سے بہت بڑا درجہ ہے۔ اور احسان میں اور ایتاء ذی القربیٰ میں یہ فرق ہے کہ احسان ایک آدمی دوسرے آدمی سے بعض حالات کے ماتحت کرتا ہے یعنی کسی کو تکلیف میں دیکھا اور اس پر رحم آگیا تو اس پر احسان کر دیا۔ کسی نے کبھی پہلے کوئی سلوک کیا ہؤا ہو تو اس کا بدلہ اتار کر اس کے احسان کو یاد کر کے اس کے ساتھ کچھ مروت کر دی غرض عام احسان کا محرک ہمیشہ رحم یا شفقت ہوتی ہے لیکن ایتاء ذی القربیٰ یعنی قریبیوں کو دینا رحم و شفقت کا نتیجہ نہیں ہوتا ایک ماں اپنے بچہ کی خدمت

کرتی ہے اور اس کی ناز برداریاں کرتی ہے نہ اس لئے کہ اس کی حالت زار دیکھتی ہے یا اسے مصیبت میں پاتی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اس کے جگر کا ٹکڑا ہے اور اس کا بیٹا ہے۔ بارہا اولاد امیر ہوتی ہے اور ماں باپ غریب ہوتے ہیں تو وہ اسی طرح اپنی اولاد کے ساتھ اپنے محدود ذرائع سے سلوک کرتے رہتے ہیں جیسا کہ ایک امیر ماں باپ اپنی حیثیت کے مطابق اپنی اولاد سے سلوک کرتے ہیں پس ماں باپ کا سلوک نہ تو انعام کی خواہش پر ہوتا ہے نہ کسی پہلے احسان کے بدلہ میں نہ مصیبت یا دکھ کا نظارہ دیکھ کر رحم کے جوش کی وجہ سے بلکہ ان کا سلوک ان تمام باتوں سے پاک ہوتا ہے اور صرف محبت اس کا باعث اور محرک ہوتی ہے۔ پس اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی یعنی ایسا دینا جیسا کہ قریبی رشتہ دار دیتے ہیں عام احسان سے زیادہ اعلیٰ درجہ کا احسان ہوتا ہے اور اسی درجہ کی طرف اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ ایک مؤمن کو صرف احسان کے درجہ پر کھڑا نہیں ہو جانا چاہئے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ آگے بڑھے اور اپنے اندر بنی نوع انسان کی ایسی محبت پیدا کرے جیسی محبت کہ مہربان باپ اور محبت کرنے والی ماں اپنے بچہ سے رکھتے ہیں اور ان سے بلا امتیاز امارت و غربت نیک سلوک کرے اور کسی وقتی جوش کے ماتحت ان سے تعلق نہ ہو۔ اسی طرح ان تین نیکیوں کے حاصل کرنے کے ساتھ ہی وہ تین بدیاں بھی ترک کرے یعنی ان بدیوں کو بھی ترک کردے جو اس کی اپنی ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور ان کو بھی جو ہیں تو اس کی ذات کے ہی متعلق مگر ایسی ہیں کہ لوگ بھی ان سے واقف ہوتے ہیں اور انہیں ناپسند کرتے ہیں اور وہ بدیاں بھی چھوڑ دے جن میں دوسرے لوگوں کے حقوق کو نقصان پہنچتا ہے یا کسی حکومت کے انتظام میں ان سے خلل آتا ہے اور ان دونوں حکموں کو ملا کر گویا شفقت علیٰ خلق اللہ کے تمام مدارج کو پورا کر دیا کیوں کہ شفقت دو ہی قسم پر منقسم ہوتی ہے اول ایصالِ خیر دوم دفعِ شر اور اس آیت میں دونوں قسموں کو بتمام و کمال بیان کر دیا گیا ہے یعنی ایک مسلم کو لوگوں سے نیکی تو اتنی کرنی چاہئے کہ عدل سے ترقی کرتے کرتے وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ لوگوں کے ساتھ ایسی محبت کے ساتھ معاملہ کرے اور بلا امتیاز ان پر اس طرح احسان کرے جس طرح ماں باپ بچہ پر کرتے ہیں اور بدی سے بھی اس قدر دور رہنا چاہئے کہ خطرناک بغاوتوں اور شرارتوں کو چھوڑتے چھوڑتے اس حد تک پہنچ جائے کہ ان بدیوں کو بھی چھوڑے جو صرف ان کے نفس کے اندر مخفی ہیں کیونکہ نہ معلوم کسی نامعلوم رنگ میں ان سے ہی کسی کو نقصان پہنچ جائے غرض شفقت علیٰ خلق اللہ کے دونوں

پہلوؤں یعنی ایصال خیر اور دفع شر کے تمام مدارج کو اس آیت میں بیان کر دیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی اور درجہ شفقت علیٰ خلق اللہ کا ہے جو انسان حاصل کر سکے اور نہ کوئی باریک بدی ہے جسے انسان چھوڑ سکے پس شفقت علیٰ خلق اللہ کے متعلق اس تعلیم سے بڑھ کر کوئی مذہب کوئی اور تعلیم پیش ہی نہیں کر سکتا کیونکہ جو آخری مقام ہے اس پر اسلام کھڑا ہے اور اس سے اوپر جانے کی انسان کے لئے گنجائش نہیں اور بڑھ کر تو کسی نے کیا پیش کرنی ہے ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس تعلیم کے برابر بھی کوئی اور مذہب کوئی تعلیم پیش نہیں کر سکتا۔

اسلام نے شفقت علیٰ خلق اللہ کے متعلق جو تعلیم اجمالی طور پر دی ہے اس کے بیان کرنے کے بعد میں اب وہ تعلیم پیش کرتا ہوں کہ جو تفصیلی طور پر شفقت علیٰ خلق اللہ کے متعلق اسلام اپنے پیروؤں کو دیتا ہے اور سب سے پہلے وہ تعلیم بیان کرتا ہوں جو رشتہ داروں کے متعلق اسلام دیتا ہے۔

والدین سے تعلق

بنی نوع انسان میں سے دنیاوی تعلقات کے لحاظ سے سب سے بڑا تعلق انسان کو اپنے والدین سے ہوتا ہے کہ ان کو خدائے تعالیٰ نے اس کے دنیا میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ والدین کی محبت جیسی پاک اور بے غرض ہوتی ہے اس کی نظیر دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ وہ اس وقت بچہ کی خبر گیری کرتے ہیں جب اسے اپنے وجود کی بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنی زندگی کے قیام کے لئے کوئی تدبیر نہیں کر سکتا ایسی حالت میں جن تکالیف سے وہ ان کی پرورش کرتے ہیں اسے صرف والدین ہی سمجھ سکتے ہیں دوسرا انسان اس کا خیال بھی نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ والدین جس محبت سے بچہ کی خبر گیری کرتے ہیں بچہ اس کا عشر عشیر بھی ادا نہیں کر سکتا اور بہت کم بچے ایسے ملیں گے جو اس احسان کا پورا بدلہ دے سکیں جو ان پر ان کے والدین نے کیا ہوتا ہے اسی وجہ سے اسلام نے ان کی فرمانبرداری کرنے کا سخت حکم دیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل : ۲۴-۲۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو اگر ماں باپ میں سے ایک یا دونوں تمہارے جوان ہونے پر بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہو اور کبھی

ان سے سختی سے کلام نہ کرو بلکہ جب ان سے بات کرو تو ادب و احترام کو مدِنظر رکھو اور ان کے آرام و آسائش کے لئے کمال رحم کے ساتھ اپنی خدمت کے بازو ان کے سامنے بچھا دو اور باوجود اس سلوک کے یہی سمجھو کہ تم نے ان کی خدمت کا حق پورے طور پر ادا نہیں کیا اس لئے خدا تعالیٰ کے حضور میں دعا کرتے رہو کہ الٰہی! میں تو ان کے احسانات کا بدلہ بھی نہیں دے سکتا پس تُو ہی ہماری طرف سے ان کا متکفل ہو جا اور جس طرح انہوں نے اس وقت کہ ہم بے بس و بے کس تھے ہماری مدد کی تُو بھی اس دن کہ یہ بے بس و بے کس ہوں اسی محبت اور پیار کے ساتھ ان سے معاملہ کیجیو۔ یہ وہ بے نظیر تعلیم ہے جو اسلام والدین کے حق میں دیتا ہے اور دنیا کا کونسا مذہب ہے جو اس کے مقابلہ میں اپنی تعلیم کو پیش کر سکے اس میں کوئی شک نہیں کہ سب مذاہب اپنے اندر خوبیاں رکھتے ہیں اور چونکہ وہ خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں اس لئے ان کے اندر بہت سی صداقتیں موجود ہیں۔ لیکن والدین کے متعلق وہ افراط و تفریط سے خالی اور کامل تعلیم جو اسلام پیش کرتا ہے اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ کس طرح ایک ہی آیت میں اول تو یہ بتایا ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور والدین کے احسان بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوتے ہیں پس تم ہرگز اس مذہب کی پیروی نہ کرو جو والدین کے حقوق کی ادائیگی میں اس قدر افراط سے کام لیتا ہے کہ ان کے آگے سجدہ کرنا اور عبادت کی شرائط بجا لانے کو جائز قرار دیتا ہے کیونکہ یہ کام حد سے بڑھا ہوا ہے اور والدین کی تکریم کرتے ہوئے اس میں اس حقیقی محسن کی ہتک کی گئی ہے کہ جو اس احسان کا بھی خالق ہے جو والدین انسان پر کرتے ہیں۔ دوسری بات اس آیت میں یہ بتائی ہے کہ والدین کی عبادت تو نہیں کرنی لیکن ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا ہے یہ وہ تعلیم ہے کہ جس کے مقابلہ میں اور کوئی مذہب کھڑا نہیں ہو سکتا کیونکہ دیگر مذاہب صرف یہ کہتے ہیں کہ تُو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کر اور ان کی خدمت کر لیکن اسلام صرف یہی نہیں کہتا تُو ان سے نیک سلوک کر بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تُو ان سے احسان کرنے کی کوشش کر اور احسان اس خدمت یا اس انعام کو کہتے ہیں جو دوسرے کی خدمت یا انعام سے زائد ہو۔ ایک مزدور اگر کسی شخص کی مزدوری کرتا ہے اور وہ دوسرے وقت میں اسے اس کا حق ادا کر دیتا ہے تو وہ ہرگز اس کا محسن نہیں کہلاتا محسن وہ کہلاتا ہے جو اس کے حق سے زیادہ بدلہ اس کو دے۔ پس اسلام نے والدین کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ تُو ان سے نیک سلوک کر کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے

والدین سے نیک سلوک کرے لیکن اس کا نیک سلوک اس سلوک کی حد کو بھی نہ پہنچے جو والدین نے اس سے کیا تھا پس ایسے شخص کا سلوک نیک تو کہلائے گا لیکن وہ ان کا محسن نہیں کہلا سکتا محسن وہ تبھی کہلا سکتا ہے جب ان کے سلوک سے بڑھ کر محبت کا سلوک کرے اور والدین کے سلوک کو مدِّنظر رکھتے ہوئے۔دیکھو کہ اسلام نے والدین کے حق میں کیسی شاندار تعلیم دی ہے اور کیا کوئی اور بھی مذہب ہے جس نے اس رنگ میں والدین کے ساتھ سلوک کو بیان کیا ہو کہ ایک طرف تو افراط کو روکا ہو اور ایک طرف تفریط کو۔ ایک طرف تو عبادت سے منع کر کے خدائے تعالیٰ کی شان کا لحاظ فرمایا اور دوسری طرف ان مذاہب کی تردید کر دی جو بیوی کا تو لحاظ کرتے ہیں لیکن والدین کی نسبت کوئی حکم نہیں دیتے اور بیاہ کے بعد بیوی کو ہی تمام تر توجہ کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اگر والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اُف تک بھی نہ کہو کہ فلاں کام تمہارا ہم ناپسند کرتے ہیں۔ بوڑھے ہو جانے کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ اول تو جب والدین خود کام کے قابل ہوں تو وہ اپنی اولاد پر بوجھ نہیں ڈالتے۔ دوم جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو بوجہ بیدست وپا ہونے کے اور مختلف قسم کی بیماریوں اور ضعفوں کے پیدا ہو جانے کے اس کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے پس فرمایا کہ اس حالت میں بھی کہ جب وہ نہایت چِڑ چڑے اور تُرش رو ہو جائیں اور ان کی حرکات برداشت سے باہر ہوتی جائیں تم کو چاہئے کہ ان کی کسی حرکت پر اظہارِ ناراضگی نہ کرو بلکہ (ان کی خواہش) اگر پوری کر سکتے ہو تو کر دو اور اگر پوری نہیں کر سکتے تو بڑی نرمی سے عرض کر دو کہ یہ بات ہماری طاقت سے باہر ہے اور جب ان سے کلام کرو تو نہایت ادب کے ساتھ کرو اور ان کے سامنے ایسے نرم ہو جاؤ کہ گویا رحمت کے مارے تم ان کے سامنے بچھے جاتے ہو اور پھر اسی پر بس نہ کرو بلکہ ان کے لئے دعائیں کرتے رہو کہ ان کی خدمت میں جو کچھ کوتاہی ہم سے ہوتی ہے اس کا بدلہ خدائے تعالیٰ اپنے پاس سے ان کو دے۔ یہ تو وہ سلوک ہے جس کا حکم اسلام نے اولاد کو اس حالت میں دیا ہے جب وہ زندہ ہو لیکن اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے والدین زندہ ہوں تو پھر بھی والدین کو نہیں بھلایا اور نہ ان کے حقوق کی نگہداشت میں دوسرے رشتہ داروں کو بھلا دیا ہے۔ نہ تو اسلام نے بعض مذاہب کی طرح یہ حکم دیا ہے کہ اولاد کا سب مال والدین کو دے دیا جائے کیونکہ اس طرح کئی اور رشتہ داروں کی کہ وہ بھی رحم کے مستحق ہوتے ہیں حق تلفی ہے مثلاً اگر اس کی بیوی ہو اور چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو وہ اس حکم کے ماتحت بالکل بے دست وپارہ

جاتے ہیں۔ اور نہ اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ والدین کو بالکل محروم رکھا جائے جیسا کہ بعض دیگر مذاہب کی تعلیم ہے بلکہ اسلام نے ان دونوں تعلیموں کے خلاف ایک میانہ راہ اختیار کی ہے اور وہ یہ کہ مرنے والے کے مال کے ایک حصہ کا وارث والدین کو قرار دیا ہے یعنی اگر اس کی اولاد ہو تو چھٹا چھٹا حصہ والدین کو دیا جائے اور اگر اولاد نہ ہو تو تیسرا حصہ والدہ کو اور باقی کُل والد کو لیکن بہ صورت خاوند یا بیوی کے موجود ہونے کے ان کا حصہ نکال کر باقی اس کو ملے گا۔

ماں باپ کا اولاد سے سلوک

والدین سے جس سلوک کا اولاد کو حکم دیا ہے اسے تو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اب دوسرے نمبر پر اس سلوک کا ذکر کرتے ہیں جس کا حکم والدین کو ان کی اولاد کے متعلق دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ والدین کے دل میں اپنی اولاد سے طبعاً محبت ہوتی ہے اور انہیں اپنی اولاد سے نیک معاملہ کرنے کے متعلق کسی خاص حکم کی بظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن تاریخ عالم ہمیں بتاتی ہے کہ اصل واقعہ یوں نہیں بلکہ باوجود اس فطرتی محبت کے جو والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے کئی وجوہ سے اس بات کی ضرورت ہے کہ والدین کو بھی اس بات کی ہدایت کی جائے کہ اپنی اولاد سے کیا سلوک کریں اور مختلف مذاہب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس تعلیم سے خالی ہونے کی وجہ سے ان کے پیروان کو سخت دقتیں پیش آئی ہیں۔ سوائے ایک ورثہ کے کہ اس کی ضرورت ہر ایک گھر میں پیش آتی تھی باقی امور کے متعلق دیگر مذاہب بالکل خاموش ہیں اور نہیں بتاتے کہ والدین کو اپنی اولاد سے کیسا معاملہ کرنا چاہئے۔ لیکن اسلام چونکہ کامل اور آخری مذہب ہے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے آیا ہے کہ اس نقص سے خالی ہے کیونکہ وہ ایسے زمانہ میں آیا جب بنی نوع انسان کی حالت چاہتی تھی کہ ان کو ایک ایسی شریعت دی جائے جو ہر رنگ میں کامل ہو اور جس میں انسانی معاملات کے تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا جائے۔ اسلام سے جو پہلے مذاہب ہیں ان کو صرف اسی قدر تعلیم کی ضرورت تھی جو اس وقت کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور جس کے ذریعے اس وقت کے لوگوں کو اِس کامل شریعت کے قبول کرنے کے لئے تیار کیا جائے جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے روز ازل سے مقدر تھی۔

اولاد کا قتل

مختلف ممالک میں کسی نہ کسی سبب سے اولاد کے قتل کر دینے کا رواج تھا اور بعض لوگ لڑکیوں کو اس لئے قتل کر دیتے تھے کہ وہ کسی اور گھر میں بیاہی

جائیں گی اور اس میں ہماری ہتک ہے۔ بعض اس خوف سے کہ کہیں بڑی ہو کر وہ کوئی گناہ نہ کر بیٹھیں اور اس میں ہماری ذلت ہو ان کو قتل کر دیتے بعض بوجہ غربت کے بچوں کو ضائع کر دیتے کہ ان کو کھانا کون کھلائے گا۔ چنانچہ ان دنوں میں کہ تعلیم گراں ہے بہت سے لوگ یورپ و امریکہ و ایشیاء کے ایسے ہیں جو ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ جن سے اولاد نہ ہو اور یہ بھی ایک قسم اولاد کے ضائع کر دینے کی ہے۔ جب ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں کہ اس وقت تعلیم نہایت گراں ہے اولاد زیادہ ہوئی تو ان کو تعلیم دلانا مشکل ہو گا۔ اسلام نے اس فعل کو سخت ناپسند فرمایا ہے اور فرماتا ہے کہ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر : ۹، ۱۰) جو لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیتے ہیں ان سے سوال کیا جائے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا اور کس گناہ کی سزا میں کیا۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا۔ (بنی اسرائیل : ۳۲) یعنی اپنی اولاد کو اس ڈر سے نہ قتل کر دیا کرو کہ ہمارے مال ان کی تربیت اور تعلیم اور کھلانے اور پلانے پر خرچ ہوں گے کیونکہ تم کو بھی جو کچھ ملتا ہے ہمارے خزانہ سے ملتا ہے اور ان کو بھی ہم ہی دیں گے اور پھر اس شک کو دور کرنے کے لئے کہ کیا صرف مال کے فنا ہو جانے کے ڈر سے اولاد کو مارنا منع ہے یا اس کا کوئی اور باعث بھی ہو تب بھی منع ہے فرمایا کہ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا اولاد کا مارنا ہی بڑا گناہ تھا یعنی مال کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مارنا ہی گناہ نہیں بلکہ منع کرنے کا اصل باعث یہی ہے کہ اولاد کا قتل کرنا خواہ وہ کسی باعث سے ہو گناہ اور برا کام ہے اور اوپر جو وجہ بتائی گئی ہے صرف بطور ایک مثال کے ہے۔

یہ تو اولاد کو قتل کرنے کے متعلق اسلام کی تعلیم ہے اس کے بعد وہ تعلیم ہے جس میں اولاد کی تعلیم و تربیت کے متعلق احکام ہیں۔ پہلا حکم ان کی ولایت کے متعلق ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ اولاد کی کفالت والد کے ذمہ ہے اور اس طرح اولاد کو اس تباہی سے بچالیا گیا ہے جو اس وقت ان کو پیش آتی ہے جب بعض دفعہ والدین میں لڑائی ہو جانے کی وجہ سے بعض والد اولاد کا خرچ اس لئے ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ وہ اس والدہ کے بچہ ہیں جس سے وہ ناراض ہیں۔ اس حکم کے ماتحت خواہ والد راضی ہو یا نہ ہو حکومت اسے مجبور کرے گی کہ وہ اپنے ذرائع آمد کے مطابق اولاد کو ان کے بلوغ تک خرچ دے۔

اس کے علاوہ اولاد کی تربیت کے متعلق بھی اسلام بہت تاکید کرتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (التحریم : ۷)۔ یعنی اے لوگو اپنی جانوں کو اور اپنے اہل و عیال بیوی اور بچوں کو بھی آگ سے بچاؤ یعنی ان کو تعلیم و تربیت دو اور یوں ہی آوارہ نہ رہنے دو کہ جاہل رہ کر خدائے تعالیٰ سے بھی پھر جائیں اور آخر ہلاک اور برباد ہو جائیں۔

اسی طرح اولاد کی تربیت کے متعلق حدیث میں حکم آتا ہے کہ ان کی عزت کرو اور ایسا معاملہ ان سے نہ کرو جس کا نتیجہ آخر یہ نکلے کہ ان کے اندر دنائت پیدا ہو جائے۔ اسی طرح فرمایا کہ اولاد کو علم و عقل سکھانا صدقہ و خیرات سے بہتر ہے اور یہ بات بھی درست ہے کیونکہ جو شخص لوگوں کی خیر خواہی میں اپنی اولاد کی تربیت کو بھول جاتا ہے وہ اپنے ساتھ ہی نیکی کو ختم کر دیتا ہے اور جو شخص اپنی اولاد کو بھی علم و عقل اور نیکی کی تعلیم دیتا ہے وہ ایصال خیر کا دروازہ اپنی موت کے بعد بھی کھلا چھوڑ جاتا ہے۔

اسی طرح اولاد کو مارنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے اور حکم ہے کہ اولاد کو دکھ دینا اور ستانا درست نہیں اور اس کی یہ حکمت ہے کہ مارنے اور دکھ دینے سے ہمیشہ اخلاق ناقص اور خراب ہو جاتے ہیں اور آئندہ زندگی میں انسان کام کا نہیں رہتا لیکن چونکہ اولاد کی تربیت میں کبھی مارنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے اگر کبھی ضرورت اور مجبوری ہو تو اس کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ مونہہ پر نہ مارا جائے بلکہ کسی ایسی جگہ مارا جائے جس پر مارنے سے اس کے جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ (سنن ابی داؤد کتاب الحدود باب فی ضرب الوجہ فی الحد)

پھر بھائیوں کی محبت قائم رکھنے کے لئے حکم دیا کہ والدین کو سب بیٹوں اور بیٹیوں سے برابر کا سلوک اور معاملہ کرنا چاہئے اور بعض سے خاص رعایت کا معاملہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپس میں جھگڑے اور لڑائیوں کی نوبت پہنچ جاتی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنے فلاں بیٹے کو ایک غلام دیا ہے آپ گواہ رہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا سب بیٹوں کو دیا ہے اس نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا کیا تیرا دل چاہتا ہے کہ سب ایک سے نیک ہوں اس نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا تو کس طرح پسند کرتا ہے کہ ایک بیٹے کو خاص کر کے انعام دے یہ جائز نہیں۔ یا سب کو دے یا اس سے واپس کر لے۔ اس طرح آپ نے بتایا کہ جب تم ایک بیٹے کو دوسرے سے خاص کرو

گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دوسرے اس سے بغض کریں گے اور آخر اس کے دشمن ہو کر گناہ میں مبتلا ہوں گے پس جبکہ ایک باپ نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد گناہ گار اور ایسی راہ پر چلے جس سے خدائے تعالیٰ سے دور ہو جائے تو وہ کیوں اپنے ہاتھ سے ایسے سامان کرتا ہے کہ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی اولاد میں سے بعض گناہ گار ہوں گے۔ اس تعلیم کا مقابلہ بعض اقوام کے اس طریق عمل سے کرو جو وہ اپنی اولاد سے کرتے ہیں کہ ایک کو وارث بنا کر باقی سب کو محروم کر دیتے ہیں تو معلوم ہو گا کہ اسلام نے کس طرح باریک در باریک مسائل کو بھی کھول دیا ہے تا لوگ ٹھوکر کھا کر ہلاک نہ ہوں چنانچہ اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی کوئی شخص اپنے کسی بیٹے کو زائد مال نہیں دے سکتا۔

علاوہ ان احکام کے عورتوں کی قابل رحم حالت معلوم کر کے اسلام نے لڑکیوں کی تربیت اور ان کی خبرگیری کے لئے خاص طور پر حکم دیا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جسکو خدائے تعالیٰ تین بیٹیاں دے اور وہ ان کی اچھی طرح خبرگیری کرے تو وہ اس کیلئے جہنم سے بچانے کا ذریعہ ہو جائیں گی۔ (ابن ماجہ کتاب الادب باب بر الوالد وا حسانہ الی البنات)

ان تمام احکام سے ہر ایک شخص معلوم کر سکتا ہے کہ شفقت علیٰ خلق اللہ کے اس پہلو کو جسے اکثر مذاہب نے یا تو بالکل ترک کر دیا ہے یا نہایت ناقص احکام اس کے متعلق دیئے ہیں۔ اسلام نے کس کامل طور پر بیان کیا ہے اور کس طرح والدین کو ایسے راستہ پر چلایا ہے کہ جس پر چل کر وہ اپنی اولاد کو ہلاکت سے بچا سکتے ہیں اور خود ہلاکت سے بچ سکتے ہیں۔ کیا کوئی اور مذہب ہے جس نے اولاد کے حق میں ایسے بالتفصیل احکام دیئے ہیں۔ اگر نہیں تو اسلام کے مقابلہ میں کسی اور مذہب کا کیا حق ہے کہ دنیا کی اصلاح کا دعویٰ کرے وہ مذاہب اپنا وقت ختم کر چکے اور اپنے اپنے وقتوں میں انہوں نے بھی دنیا کو فائدہ پہنچایا لیکن اس کامل مذہب کے آنے پر اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔

بھائیوں کے متعلق احکام

ماں باپ اور اولاد کے علاوہ اسلام نے بھائیوں اور بہنوں کو بھی فراموش نہیں کیا اور ان سے بھی نیک سلوک کا حکم دیا ہے اور اولاد و والدین کی عدم موجودگی میں ان کو اپنے بھائی کا وارث بنا کر ان کے سلوک کو کامل کیا ہے۔

بیوی کے متعلق احکام

گو مختلف مذاہب اس ترقی علوم کے زمانہ میں اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کا مذہب عورتوں کے حقوق کی دیگر سب مذاہب سے زیادہ خبر گیری کرتا ہے اور ان کے حقوق بیان کرتا ہے لیکن ان کا یہ دعویٰ قابل توجہ نہیں کیونکہ کوئی مذہب ایسا نہیں جو عورتوں کے حقوق کو اپنے مذہب کی طرف سے پیش کرے بلکہ موجودہ زمانہ کی تمدنی حالت کے لحاظ سے اپنا دعویٰ پیش کیا جاتا ہے حالانکہ کسی خاص شخص یا خاص قوم کا عمل اس کے مذہب کو تعریف کا مستحق نہیں بنا سکتا جب تک کہ خود اس مذہب کی طرف سے وہ تعلیم نہ پیش کی گئی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے سوا جس قدر دیگر مذاہب ہیں وہ باوجود سینکڑوں ہزاروں خوبیاں رکھنے کے بوجہ اس کے کہ صرف خاص زمانہ اور خاص قوم کے لئے تھے عورت کے حقوق کے متعلق بہت حد تک خاموش ہیں چنانچہ اسلام سے سب سے قریب کا مذہب مسیحیت بھی عورت کے متعلق کوئی مشرح تعلیم نہیں دیتا اور یورپ کا طریق عمل مسیحیت کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مسیحیت کے حکم سے نہیں پیدا ہوُا بلکہ علوم کی ترقی یا اسلام کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ہاں اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے اپنی توجہ کو اس مظلوم فرقہ کے بلند کرنے کی طرف بھی کی ہے اور اپنی شفقت کو صرف کسی خاص گروہ کے ساتھ خاص نہیں کیا چنانچہ والدہ بیٹی اور بہن کے متعلق جو احکام اسلام نے دیئے ہیں وہ تو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اب ہم بیوی کے متعلق جو احکام اسلام نے دیئے ہیں ان کو بیان کرتے ہیں۔ دیگر مذاہب میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اس موضوع کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور جنہوں نے اس کے متعلق کچھ احکام بیان کئے ہیں وہ نہایت ناقص اور نامکمل ہیں اور آج سے سینکڑوں سال پہلے جب علوم و تمدن کی حالت گری ہوئی تھی اس وقت کے لئے تو بے شک عورتوں کو بعض شدید مظالم سے بچانے کے لئے کافی ہوں گے لیکن اب جبکہ تمام جہان میں ایک زندگی کی روح پھونکی گئی ہے ان پر عمل کر کے بیویوں کے حقوق کی کامل طور پر نگہداشت نہیں ہو سکتی اور صرف اسلام ہی کے احکام ایسے کامل ہیں کہ ان کے ذریعہ سے عورتوں کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں عورتوں کے حقوق کے متعلق سب سے پہلا حکم جس کے ذریعہ سے اسلام عورتوں کو یک لخت پستی کی حالت سے بلند کر کے مرد کے برابر لا کھڑا کرتا ہے یہ ہے کہ عورت و مرد دونوں کو ایک ہی قسم کے اور ایک ہی جنس کے قرار دے کر برابر کے حقوق کا مستحق کر دیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (النحل : ۷۳) یعنی

اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں پس تم کو یہ نہیں چاہئے کہ ان کو کوئی ادنیٰ مخلوق سمجھ کر ان کو حقارت کی نظر سے دیکھو اور ان کے ساتھ درشتی یا سختی سے پیش آؤ۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں مرد و عورت کے حقوق کے متعلق حکم ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ : ۲۲۹) یعنی عورتوں کو مردوں پر اسی قسم کے حقوق حاصل ہیں جس قسم کے مردوں کو عورتوں پر۔ ہاں مردوں کو عورتوں پر انتظامی معاملات میں ایک درجہ عطا ہے یعنی گھر کا آخری فیصلہ مرد کے اختیار میں ہوتا ہے اور یہ حکم ایسا ہے کہ جس نے عورتوں کے حقوق کے متعلق جو افراط کی جاتی ہے اس کو مٹا دیا ہے بعض لوگ عورتوں کو معلقہ کے طور پر چھوڑ رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ نہیں کرتے ان کے متعلق حکم دیا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوهُنَّ (النساء : ۲۰) یعنی یہ نہ کرو کہ نہ ان سے نیک معاملہ کرو اور نہ ان کو آزاد کرو تا اس طرح ڈرا کر تم ان سے ان کا مال چھین لو۔ اسی طرح حکم دیا کہ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء : ۲۰) عورتوں سے نہایت عمدہ معاملہ کرو۔ پھر عورتوں کے حقوق کو پورا کرنے کے لئے اسلام ان کو اپنے خاوندوں کے مال میں سے اولاد ہونے کی صورت میں آٹھویں حصہ کا اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں چوتھے حصہ کا وارث قرار دیتا ہے اور پھر جس مال کی وہ مالک ہو جائیں اس پر انہی کا قبضہ قرار دیتا ہے نہ ان کے والدین یا خاوندوں کا۔ قرآن کریم کے احکام کے علاوہ رسول کریم ﷺ نے بھی اپنے عمل اور اپنی تاکیدات سے عورتوں کے حقوق نہایت تاکید کے ساتھ قائم کئے ہیں اور یہاں تک فرمادیا کہ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ (ابن ماجہ کتاب النکاح باب حسن معاشرۃ النساء) تم میں سے سب سے بہتر وہی انسان ہے جو اپنی بیوی سے سب سے بہتر سلوک کرتا ہے اسی طرح فرمایا کہ اے مسلمانو! عورت کے متعلق میری یہ بات مانو کہ ان کے ساتھ نیک معاملہ کیا کرو تمہارا کوئی حق نہیں کہ اپنی بیویوں سے نیک سلوک کے سوا کسی اور قسم کا سلوک کرو سوائے اس کے کہ وہ ایسی بدی کریں جسے سب لوگ برا منائیں اور جو نہایت کھلی کھلی ہو۔ اگر وہ کوئی ایسی بدی کریں تو کچھ دن اپنے سے علیحدہ کرو اگر مان لیں تو بہتر ورنہ ان کو کچھ بدنی سزا دو لیکن ایسی سزا نہ ہو کہ ان کے جسم پر اس سے نشان پڑ جائیں۔ (ابن ماجہ کتاب النکاح باب حق المرأۃ علی الزوج)

جس طرح اسلام نے مرد پر عورت کے کچھ حقوق رکھے ہیں عورت پر بھی مرد کے کچھ

حقوق رکھے ہیں عورت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کی امانت کو پوری طرح ادا کرے اس کے آرام اور اس کے سکھ کی فکر کرے اس کی مشکل کے وقت اس کی غمگسار ہو اس کی اولاد کی تربیت کرے اور اس کی ناشکری نہ کرے۔ غرض یہ نہیں کیا کہ اگر مرد کے حقوق بیان کئے ہوں تو عورتوں کو ترک کر دیا ہو اور اگر عورت کے حقوق بیان کئے ہوں تو مرد کے حقوق کو نظر انداز کر دیا ہو یا دونوں کے حقوق بیان کئے ہوں لیکن ان میں افراط و تفریط سے کام لیا ہو۔ بلکہ مرد و عورت کے تمام حقوق کو نہایت مناسب طور پر تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر بیان کیا ہے اور اس طرح اس عظیم الشان تعلق کو جو تمام انسانی ترقی کی جڑ ہے ایسی مضبوط چٹان پر قائم کر دیا ہے کہ کوئی آندھی اور کوئی طوفان اس کو ہلا نہیں سکتا۔

دیگر رشتہ داروں کے ساتھ سلوک

ان نہایت ہی قریبی رشتہ داروں کے علاوہ جن کے حقوق اوپر بیان ہوئے دیگر رشتہ داروں کو بھی اسلام نے فراموش نہیں کیا چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (الروم : ۳۹) یعنی جو تمہارے قریبی اور رشتہ دار ہیں ان کو ان کا حق ادا کرو۔ اس حکم کے ذریعہ نہ صرف رشتہ داروں کے ساتھ نیک تعلقات کے قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ حقدار ہیں کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے اور ان سے نیک سلوک کرنا گویا ان کا حق ادا کرنا ہے۔ حق کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ رشتہ داروں کو بہت دفعہ ماں باپ یا خاوند کے نہ ہونے کی وجہ سے اولاد یا بیواؤں کی خبر گیری کرنی پڑتی ہے اور وہ بھی گویا ایک قسم کے ماں باپ ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان کو وقت پر ماں باپ کا ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جب رشتہ داروں کے اوپر یہ حق رکھا گیا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ ایک دوسرے کی اولاد کی کفالت کریں تو ان کا حق ہے کہ ان کے ساتھ خاص طور پر نیک سلوک کیا جائے۔ اس حکم کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں جن میں رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کوئی ایسا عمل مجھے بتائیں جس سے میں جنت کا وارث ہو جاؤں فرمایا کہ وہ عمل یہ ہے کہ تو خدا کی عبادت کر اور اس کا شریک کسی کو نہ بنا اور نماز پڑھ اور زکوٰۃ دے اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کر۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ)

ہمسایہ اور شریک سے نیک سلوک کا حکم

قرابت داروں کے علاوہ جن کا تعلق انسان کے ساتھ خون کے ذریعہ سے ہوتا ہے ایک اور قسم کے بھی قریبی ہوتے ہیں جن کو بوجہ خونی رشتہ کے تعلق نہیں ہوتا لیکن قرب مکانی کے لحاظ سے وہ بھی قریبی ہوتے ہیں اس لئے اسلام نے ان کو بھی فراموش نہیں کیا چنانچہ ان کے متعلق حکم دیا ہے کہ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (النساء : ۳۷) یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو اور قریبیوں سے بھی احسان کا معاملہ کرو اور یتامیٰ اور مساکین سے اور ہمسایہ سے جو دیوار بدیوار رہتا ہے اور اس سے بھی جو فاصلہ پر ہے احسان کرو یعنی جس کا مکان ساتھ تو نہیں لیکن ایک محلہ میں یا ایک گاؤں میں رہتا ہے یا پاس کے گاؤں میں رہتا ہے اور اس شخص کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو جو تمہاری تجارت میں شریک ہے یا ایک جگہ پر تمہارے ساتھ ملازم ہے یا تمہارا رفیق سفر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو ہمسایہ اور شریک کے متعلق کہ ایک بوجہ مکان کے پاس رہنے کے اور دوسرا بوجہ کسی کام میں اس کا ساتھی ہو جانے کے قریبیوں میں شامل ہو جاتا ہے اسلام نے دی ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے جبریل نے ہمسایہ سے نیک سلوک رکھنے کی اس قدر تاکید کی اور اتنی دفعہ کی کہ مجھے خیال ہو گیا کہ شائد ہمسایہ کو وارث قرار دے دیا جائے گا۔ (بخاری کتاب الادب باب الوصاة بالجار) اسی طرح ہم سفروں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جو شخص اونٹنی پر سوار ہو اور دوسرے آدمی کی جگہ خالی ہو تو چاہئے کہ کسی ہم سفر کو اپنے ساتھ سوار کرلے اور جو شخص کہ سفر پر ہو اور اس کے پاس کچھ زیادہ کھانا ہو وہ اپنے ہم سفر کو شریک کرے۔ ہم سفر کے علاوہ ایک مجلس میں بیٹھنے والوں کے متعلق بھی اسلام نے نیک سلوک کا حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ (المجادلہ : ۱۲) یعنی اے مؤمنو! جب تم کسی مجلس میں بیٹھے ہوئے ہو اور کوئی اور آدمی آکر کہے کہ ذرا کھل جاؤ اور ہمیں بھی جگہ دو تو چاہئے کہ تم سمٹ کر جگہ دے دیا کرو۔ خدا تعالیٰ تم کو اپنے قرب میں جگہ دے گا۔ اسی طرح ہم مجلس کی فیلنگز کا خیال رکھنے کے لئے رسول کریم ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جب ایک جگہ پر

تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو مل کر سرگوشیاں نہ کیا کریں کیونکہ اس سے تیسرے کو تکلیف ہوتی ہے۔ (بخاری کتاب الاستیذان باب لایتناجیٰ اثنان دون الثالث)

بڑوں کے ساتھ چھوٹوں کا معاملہ اور چھوٹوں کے ساتھ بڑوں کا معاملہ

علاوہ ان تفصیلی احکام کے ان تمام تعلقات کے متعلق جو اوپر بیان ہوئے ہیں ایک عام حکم بھی اسلام نے دیا ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا۔ (ترمذی ابواب البر و الصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان) یعنی جو چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا ادب نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔ اسی مختصر مگر جامع فقرہ میں تمام ان تعلقات کی تشریح کر دی جو چھوٹوں اور بڑوں کے متعلق ہیں۔

مہمان کے ساتھ نیک سلوک

جہاں اور متعلقین کے ساتھ اسلام نے نیک سلوک کا حکم دیا ہے وہاں مہمان کو بھی فراموش نہیں کیا چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ (ابوداؤد کتاب الاطعمۃ باب فی الضیافۃ) یعنی جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے مہمانوں کی عزت کرے۔

دشمن کے ساتھ تعلق

دوستی اور محبت کے تعلق کے علاوہ ایک تعلق انسان کا دشمن سے بھی ہوتا ہے اور یہ تعلق ایسا ہے کہ اس میں پڑ کر انسان کا حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر کہاں تک شفقت علیٰ خلق اللہ کا مادہ رکھتا ہے کیونکہ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تو انسان محبت کی وجہ سے نیک سلوک کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جہاں محبت نہ ہو بلکہ عداوت ہو ایسی جگہ پر انسان کی قلبی کیفیت کا علم ہو سکتا ہے۔ پس وہ مذہب جو دشمنوں کے متعلق بھی ایسی تعلیم دے جو شفقت اور رحمت والی ہو اور ہر ایک فساد اور شر سے پاک ہو وہی مذہب اس قابل ہے کہ دنیا کی اصلاح کا کام اس کے سپرد کیا جائے۔ مختلف مذاہب نے دشمنوں کے متعلق مختلف تعلیمیں دی ہیں لیکن ایک ادنیٰ غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو تعلیم اسلام نے اپنے دشمنوں سے سلوک کے متعلق دی ہے وہی ایسی تعلیم ہے جو ہر ایک زمانہ اور ہر ایک ملک کی اصلاح کا باعث ہو سکتی ہے اور جس کے ذریعہ سے دنیا میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ اسلام دشمنی اور عداوت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک دینی اور ایک دنیاوی۔ دینی

عداوت سے مراد وہ عداوت ہے جس کا باعث اختلاف مذہبی ہو اور دنیاوی عداوت سے مراد وہ عداوت ہے جس کا باعث کوئی دنیاوی جھگڑا یا فساد ہو۔ ان دونوں کا ذکر الگ الگ کیا جائے گا۔ پہلے ہم دنیوی عداوت کو لیتے ہیں کہ اس کے متعلق اسلام کا کیا حکم ہے۔ سو یاد رہے کہ وہ عداوت جس کا باعث کوئی دنیاوی جھگڑا یا فساد ہو اسلام نے دو قسموں میں تقسیم کی ہے ایک وہ جس کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور ایک جس کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے۔ جس کا تعلق قلب کے ساتھ ہے اس کے متعلق اسلام کا یہ حکم ہے کہ تم اس کی بالکل پرواہ نہ کرو اور ہرگز کسی شخص کا بغض اپنے دل میں نہ رکھو حتیٰ کہ یہ بھی منع فرمایا کہ اگر کسی شخص سے جھگڑا ہو جائے تو اس سے کلام ترک کردے بلکہ فرمایا کہ تین دن سے زیادہ کسی شخص سے کلام ترک کرنا منع ہے پھر فرمایا کہ جو شخص کسی سے جھگڑا ہو جانے پر سب سے پہلے اپنے دل سے بغض نکال کر اس سے صلح کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہوتا ہے۔ (بخاری کتاب الادب باب الہجرۃ۔ مسلم کتاب البر والصلۃ) غرض قلبی عداوت سے اسلام قطعی طور پر روکتا ہے اور بڑے زور سے اپنے پیروؤں کو اس سے باز رکھتا ہے کیونکہ یہ انسان کے لئے ایک زہر کی طرح ہوتی ہے جو اندر ہی اندر اس کے تمام اخلاق حسنہ کو برباد کر دیتی ہے اور اس کا نتیجہ خطرناک فتن ہوتے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ چلتے ہیں اور قوموں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ تعلیم تو وہ ہے جو اسلام نے اس عداوت کے متعلق دی ہے جس کا مرکز قلب ہوتا ہے۔ باقی رہی وہ عداوت جو اعمال سے تعلق رکھتی ہے یعنی ذہنی اور خیالی عداوت نہ ہو بلکہ عملی طور پر ظاہر ہو یعنی ایک شخص ظلم سے کسی کو نقصان پہنچاتا ہو اور اسے دکھ دیتا ہو تو اس کی نسبت اسلام نے پہلا حکم تو یہ دیا ہے کہ دل میں بغض تو ایسے شخص کے متعلق بھی نہ رکھے کیونکہ کینہ رکھنا ہر حال میں منع ہے کیونکہ وہ فتنوں کا پیدا کرنے والا ہے اور اخلاق کا بگاڑنے والا ہے۔ باقی رہا دشمن کی عملی شرارت کا بدلہ سو اس کے متعلق دو حکم ہیں ایک یہ کہ عفو کرو دوسرا یہ کہ سزا دو اور یہ دونوں حکم مختلف موقعوں کے متعلق ہیں کسی موقعہ پر عفو کا حکم ہے اور کسی موقعہ پر سزا کا حکم ہے اور یہ دونوں حکم اور ان کا موقعہ اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (الشوریٰ : ۴۱) یعنی برائی کی سزا اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ بدی ہو لیکن جو شخص کہ معاف کر دے ایسی صورت میں کہ اس کے عفو سے اصلاح ہوتی ہو پس اس کا اجر اللہ پر ہے اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ

نے ایک دشمن کی شرارت کے مقابلہ میں دو قسم کے سلوک کا ایک مؤمن کو حکم دیا ہے ایک یہ کہ اسی قدر سزا اسے دلوا دو۔ دوسرے یہ کہ اسے معاف کر دو اور دونوں کا موقعہ بھی بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جہاں امید ہو کہ معاف کرنے سے اصلاح ہوتی ہے وہاں معاف کر دینا چاہئے اور جہاں معاف کرنے سے اصلاح نہ ہوتی ہو وہاں سزا دلانی چاہئے۔ اور یہ حکم در حقیقت دو قسم کی طبائع کے لوگوں کے لئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں میں سے دو قسم کے انسان ہیں ایک ایسے ہیں کہ جب ان کے قصور کو نظرانداز کیا جائے اور باوجود ان کی شرارت کے ان سے چشم پوشی کی جائے تو ان پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ آئندہ دشمنی سے باز آجاتے ہیں اور اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوتے ہیں اور بجائے دشمن کے دوست بن جاتے ہیں چنانچہ یہ وجہ بھی خود قرآن کریم نے ہی بیان فرمائی ہے جیسا کہ فرمایا وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ۔اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حٰمٓ السجدہ: ۳۵) یعنی نیکی کرنی اور بخش دینا اور سزا دینی ایک نہیں ہو سکتے پس تو اپنے دشمن کی شرارت کا نیک سلوک کے ساتھ جواب دے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص کے ساتھ تیرا تعلق عداوت کا تھا وہ ایک گہرا دوست بن جائے گا۔ اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عفو میں اللہ تعالیٰ نے کونسی حکمت رکھی ہے اور اس سے کیا غرض ہے۔ پس عفو جیسا کہ پہلی آیت سے ظاہر ہے اسی وقت کرنا چاہئے جب اس میں اصلاح ہوتی ہو اور جب عفو سے اصلاح نہ ہوتی ہو بلکہ وہ شخص اور بگڑتا ہو تو اس وقت سزا دینی چاہئے کیونکہ اس وقت عفو کرنا در حقیقت اس شخص پر بھی اور دیگر بنی نوع انسان پر بھی ظلم کرنا ہے کیونکہ ایسے شخص سے عفو کرنے کا جو عفو سے اور بھی تیز ہوتا ہے اور بغیر سزا کے مانتا ہی نہیں یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ شرارت پر اور دلیر ہو جائے گا اور دوسرے لوگوں پر بھی زیادتی کرے گا اور جس سے ذرا اس کا جھگڑا ہوگا اسے تباہ اور برباد کرنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح دنیا میں فتنہ ترقی کرے گا۔ اور اس تمام فتنہ کا باعث یہی شخص ہوگا جس نے ایسے شریر آدمی کو جو دوسروں کو دکھ دیتا ہے اور ان پر ظلم کرتا ہے خالی چھوڑ دیا اور باوجود اس بات کے تجربہ کے کہ عفو سے وہ نہیں مانتا اس سے درگزر کیا۔ اس موقعہ پر شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ کسی شخص کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ جس شخص سے میرا معاملہ پڑا ہے وہ سزا سے مانے گا یا عفو سے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے معلوم ہوگی اگر دو تین دفعہ کے تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص عفو اور درگزر سے اپنی

اصلاح نہیں کرتا تو پھر اس کو سزا دینا ہی بہتر سمجھے۔ اور اگر تجربہ سے اس کا عفو اور درگزر سے اپنی دشمنی اور شرارت سے باز آجانا ثابت ہو تو درگزر ہی کرے اور یہی وہ تعلیم ہے جو میانہ روی اور انصاف پر مبنی ہے اور اس کے سوا اگر کوئی تعلیم ہو تو ضرور وقتی ہی کہلا سکتی ہے۔ مثلاً یہود کو بوجہ ایک مدت تک محکومیت میں رہنے کے سزا دینے اور بدلہ لینے کی بہت تاکید کی گئی تھی تاکہ ان کے اندر جوش اور ہمت پیدا ہو چنانچہ اس تعلیم کا یہ نتیجہ نکلا کہ تھوڑی ہی مدت میں حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل اپنی کمزوری سے پاک ہو گئے ورنہ انکی یہ حالت تھی کہ جب فرعون نے انکو آگھیرا تو باوجود فرعون کے مظالم کے ان میں سے بہت تھے جو اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ ہم واپس چلے جاتے ہیں اور یہ حالت اسی وقت قوم میں پیدا ہوتی ہے کہ جب وہ حد درجہ کی بزدل ہو جائے ورنہ اپنے مظالم اور چھیڑنے والے سے تنگ آکر ایسے جانور بھی مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جو شکاری جانور نہیں ہوتے حالانکہ وہ اپنے دشمن کے مقابلہ میں کوئی بھی ہستی نہیں رکھتے۔ پس بنی اسرائیل میں سے کئی قبائل کا واپس جانے کے لئے تیار ہو جانا اور پھر ہر موقع پر ڈرنا بتاتا ہے کہ اس وقت وہ جرأت و بہادری کے لحاظ سے نہایت گری ہوئی حالت میں تھے۔ پس انکے ابھارنے اور بڑھانے کے لئے اسی بات پر زور دینے کی ضرورت تھی کہ تم بدلہ ضرور لو اور اس وقت کے مناسب حال یہ حکم تھا کہ "اور تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان آنکھ کا بدلہ آنکھ دانت کا بدلہ دانت ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا"۔ (استثناء باب ۱۹ آیت ۲۱ مطبوعہ ۱۹۲۲ء) لیکن جب ایک زمانہ گزر گیا اور نسلاً بعد نسلٍ بنی اسرائیل نے اس قاعدہ پر عمل کیا تو ان کے اندر ایک قسم کی خونخواری اور سخت دلی پیدا ہو گئی اور اس کے دور کرنے کیلئے حضرت مسیحؑ کے ذریعہ یہ اعلان کرایا گیا کہ "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جاوے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔ تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کیلئے دعا مانگو تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو اور جو تم پر لعنت کریں ان کیلئے برکت چاہو جو تم سے کینہ رکھیں انکا بھلا کرو اور جو تمہیں

دکھ دیں اور ستاویں ان کے لئے دعا مانگو" (متی باب ۵ آیت ۳۸ تا ۴۵) اس اعلان پر جن لوگوں نے کان دھرے انہوں نے اس پر عمل کرنے کی بدولت اپنے اندر سے اس خونخواری کو نکال پھینکا جو اس وقت کے بنی اسرائیل کے دل میں پیدا ہو گئی تھی اور رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی جو بجائے لڑنے اور جھگڑنے کے محبت و پیار کرنے والے تھے لیکن کیا یہ تعلیم ہمیشہ کے لئے اور ہر ملک کے لئے ہو سکتی تھی کیا اس سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا تھا اور بنی نوع انسان کی اصلاح ممکن تھی؟ اپنے وقت میں اس تعلیم سے بے شک نہایت عمدہ اور نیک نتائج پیدا ہوئے لیکن اس کا رواج انہی میں دیا جا سکتا تھا جو موسوی تعلیم پر عمل کرتے کرتے دوسری حد پر پہنچ گئے تھے ورنہ سب دنیا میں اس پر عمل ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ اس وقت نہ اس کے بعد۔ پس ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا کے لئے کوئی ایسی تعلیم آتی جو دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہوتی اور ہر ایک موقعہ و محل کے مناسب انسان کو ہدایت کرتی۔ چنانچہ قرآن کریم آیا اور جیسا کہ ابھی آپ لوگوں کے سامنے پڑھا گیا ہے قرآن کریم نے ایک طرف تو موسوی شریعت کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ شریر اور بدکار کو اس کی بدی کے اندازہ کے مطابق سزا دو اور دوسری طرف مسیحی تعلیم کو بھی پیش کیا کہ تُو بدی کے بدلہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ نیک سلوک کر اور ان دونوں تعلیموں سے زائد بات یہ بیان فرما دی کہ جہاں سزا سے اصلاح ہوتی ہو وہاں سزا دے اور جہاں عفو سے اصلاح ہوتی ہو وہاں عفو کر۔ غرض دونوں سلوکوں میں سے جو سلوک بھی اس شخص کے مناسب حال ہو اس سے کر۔ تا دنیا میں حقیقی امن قائم ہو اور دنیا سے ظلم اور بے جا عداوت دور ہو۔ اور یہی تعلیم ہے جو درمیانی ہے اور ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے اور ایک ادنیٰ سے غور سے بھی انسان معلوم کر سکتا ہے کہ اس تعلیم کے بغیر اور کوئی تعلیم نہیں جسے سب دنیا میں رائج کیا جا سکے اور جس پر عمل کرنے سے انسانی طبیعت کے ایک طرف جھک جانے کا خطرہ بالکل مٹ جائے۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ ایسی کامل تعلیم اور کسی مذہب میں موجود نہیں اور اگر ہے تو اس مذہب کے پیروؤں کو چاہئے کہ ان تمام شرائط کے ساتھ مشروط تعلیم اپنی مذہبی کتب سے بھی دکھائیں۔ دنیا میں تین ہی قسم کے مذہب نکلیں گے یا وہ جو کہتے ہیں کہ تو بدی کے بدلہ میں بدی کر۔ یا وہ جو کہتے ہیں کہ تو بدی کے بدلہ میں بھی نیکی ہی کر۔ یا وہ جو بلا کسی شرط کے یہ بھی کہتے ہیں کہ تو معاف کر اور یہ بھی کہ سزا دے۔ لیکن سوائے اسلام کے ایسا کوئی مذہب نہ پاؤ گے جو انسان کو یہ بھی بتاتا ہو کہ تو سزا کس

وقت دے اور معاف کس وقت کرے۔ اور جب تک مذہب انسان کو اسباب کی بھی ہدایت نہ کرتا ہو اس وقت تک اس کی تعلیم کامل نہیں کہلا سکتی۔

مذہبی عداوتیں اس بیان کے بعد اب ہم مذہبی اعداء کو لیتے ہیں کہ ان کے ساتھ کس قسم کے سلوک کا اسلام نے حکم دیا ہے سو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام مذہبی اختلاف اور عداوت کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم نہیں دیتا کہ جن لوگوں کو تم سے مذہباً اختلاف ہے تم ان کو اپنا دشمن سمجھو اور ان سے دشمنوں کا سا سلوک کرو بلکہ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم تمام مذاہب کے پیروان کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرو اور مذہبی اختلاف کو عداوت نہ سمجھو اور ایسے لوگ جو مذہبی طور پر تم سے کوئی عداوت نہیں رکھتے اور تم پر مذہبی اختلافات کی وجہ سے کوئی ظلم نہیں کرتے ان سے بے شک احسان اور مروت سے پیش آؤ اور ان سے نیک معاملہ کرو اور انصاف کے ساتھ ان سے سلوک کرو۔ لیکن جو لوگ کہ دین کے معاملہ میں جبر سے کام لیتے ہیں اور اپنے عقیدہ کے خلاف کوئی اور عقیدہ نہیں دیکھ سکتے ان سے بالکل قطع تعلق رکھو کیونکہ یہ بات غیرت کے خلاف ہے کہ ایک شخص تمہارے دین کو تلوار کے ساتھ مٹانا چاہے اور خدا اور اس کی کتاب کو گالیاں دے اور تم اس سے دوستی رکھو چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الممتحنہ : ۹-۱۰) یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں سے جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑتے اور جنہوں نے دینی عداوت سے تم کو گھروں سے نہیں نکالا۔ نیکی اور حسن سلوک کا معاملہ کرنے سے نہیں روکتا بلکہ اللہ تعالیٰ تو عدل و انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ہاں وہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی و تعلق رکھنے سے روکتا ہے جو تم سے اس لئے جنگ کرتے ہیں کہ تم نے یہ دین کیوں اختیار کر لیا اور تم کو اسی باعث سے گھر سے بھی نکال دیا اور تمہارے دشمنوں کے مددگار ہوئے۔ ایسے لوگوں سے جو دوستی کرتا ہے وہ ظالم ہے۔ کیونکہ وہ اسے اس کے فعل بد پر اکسانے کا باعث ہوتا ہے اور اس کے عمل سے اس دشمن دین کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ دیکھو باوجود اس کے کہ میں ان کے دین کو گالیاں دیتا ہوں یہ شوق سے ملتا ہے تو ضرور ہے

کہ یہ مجھ سے متأثر ہو جائے۔ اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص غیرت سے خالی ہو جائے تو رفتہ رفتہ وہ دوسروں کے خیالات سے متأثر ہو جاتا ہے پس حفاظت دین کے لئے اور غیرت جیسے اعلیٰ درجہ کے خلق کو زندہ رکھنے کے لئے ایسی تعلیم دینی ضروری تھی کہ جو شخص دین کے معاملہ میں لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے عقیدہ کے خلاف عقیدہ سن کر ایسا آگ بگولہ ہو جاتا ہے کہ انسانیت کی معمولی شرائط کو بھی پورا نہیں کر سکتا وہ کب اس لائق ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ دوستی رکھی جائے اور اگر کوئی شخص پھر بھی اس شخص سے محبت رکھتا ہے تو ضرور اس کا دل غیرت سے خالی ہے۔ غرض اس تعلیم میں بھی اسلام نے افراط و تفریط دونوں باتوں کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کی ہے اور ایک طرف تو محبت اور پیار کو قائم کیا ہے اور دوسری طرف غیرت کو جو اخلاق حسنہ سے ہے اور جس کے بغیر انسان حیوانوں کی طرح ہو جاتا ہے زندہ رکھا ہے تا ایسا نہ ہو کہ اسلام کا پیرو کسی ایک طرف جھک جائے اور یہ وہ تعلیم ہے کہ جس کا مقابلہ نہ تو وہ مذاہب کر سکتے ہیں جو غیر مذاہب کے ساتھ کسی قسم کا تعلق جائز نہیں قرار دیتے اور نہ وہ جو باوجود شدید سے شدید مذہبی عداوت کے پھر بھی محبت کا حکم دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانی فطرت کو توڑتے ہیں جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا۔

عام بنی نوع انسان سے سلوک

اس کے بعد اب میں ان لوگوں کے متعلق اسلام کی تعلیم پیش کرتا ہوں جن سے انسان کسی قسم کا ذاتی تعلق نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس قسم میں سے سب سے اول تو یتامیٰ اور مساکین ہیں۔ گو یتیم اور مسکین ایک رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یتیم اور مسکین کے ساتھ سلوک کرنے میں اسلام نے کوئی شرط نہیں لگائی کہ وہ کن میں سے ہو اس لئے میں ان کو عام مخلوق کے عنوان کے نیچے ہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ اکثر اوقات جن یتامیٰ اور مساکین سے پالا پڑتا ہے وہ غیر ہی ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کے متعلق اسلام میں نہایت وسیع احکام ہیں جنہیں اس وقت بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آگے ہی مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے اس وقت صرف اس قدر ہی بیان کر دینا کافی ہے کہ یتامیٰ اور مساکین سے نیک سلوک کرنے کا اسلام میں نہایت زور سے حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض اس کے متعلق اوپر مضامین آ چکے ہیں۔ اس جگہ صرف یہ بات ہی لکھ دینی کافی ہوگی کہ قرآن کریم یتامیٰ کے ساتھ نیک سلوک نہ کرنے کو ان اعمال میں سے قرار دیتا ہے جن کا نتیجہ ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ بعض لوگوں پر عذاب آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا

نے ہمارے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ ان کی نسبت فرماتا ہے كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (الفجر : ۱۸) یہ بات نہیں جو تم کہتے ہو بلکہ بات یہ ہے کہ تم یتامیٰ کی خبر گیری نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو بے بس دیکھ کر ان کی طرف التفات ہی نہ کرتے تھے۔ مساکین کی نسبت فرماتا ہے کہ ان سے حُسنِ سلوک نہ کرنا ان افعال میں سے ہے جو انسان کو دوزخی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ بعض جہنمیوں کی نسبت فرماتا ہے وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (الحاقہ : ۳۵-۳۶) چونکہ وہ مساکین کی خبر گیری کی تحریک نہیں کرتے تھے اس لئے خدا تعالیٰ نے بھی ان کی مدد نہ کی ورنہ خدا تعالیٰ ان کو عذاب سے بچاتا۔

یتامیٰ اور مساکین کے علاوہ دیگر بنی نوع انسان سے سلوک کے متعلق تعلیم

ان احکام میں سے جو اسلام نے عام بنی نوع انسان کے متعلق دیئے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اتفاقاً کسی انسان کی بدی پر آگاہ ہو جائے تو اس پر پردہ ڈال دے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں لَا يَسْتُرُ عَبْدٌ عَبْدًا فِى الدُّنْيَا اِلَّا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِىْ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۸۹) یعنی کوئی بندہ کسی بندہ کا کوئی عیب چھپائے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب چھپائے گا۔

اسی طرح یہ تعلیم ہے کہ کسی انسان سے بھی ایک مسلمان کو سود لینا جائز نہیں بلکہ اگر کوئی حاجتمند ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کی مدد کرے یا اسے قرض دے کہ سود ایک زیادتی ہے جو ایک انسان دوسرے انسان پر کرتا ہے۔ کیونکہ جس وقت اس کا ایک بھائی حاجتمند ہوتا ہے اس وقت وہ اس سے اور مال بھی چھیننا چاہتا ہے۔

انہی تعلیموں میں سے یہ تعلیم بھی ہے کہ کسی شخص کو کھڑے ہوئے پانی میں پیشاب و پاخانہ کرنے کی اجازت نہیں (ترمذی ابواب الطہارۃ باب ماجاء فی کراھیۃ البول فی الماء الراکد) کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ اگر ضرورتاً ایسے پانی کو استعمال کریں گے تو بوجہ نجس ہونے کے نقصان اٹھائیں گے۔ پھر انہی تعلیموں میں سے جو اسلام نے عام بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے دی ہیں۔ یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو سایہ دار درخت یا راستہ یا پانی کی گھاٹ[1] پر پاخانہ پھرنے کی اجازت نہیں (ترمذی ابواب الطہارہ باب ماجاء ان النبی کان اذا اراد الحاجۃ ابعد فی المذھب) کیونکہ اس سے تھکے ماندے ہوئے مسافروں اور راستہ چلنے والے لوگوں اور پیاسوں کو ایذاء پہنچنے کا اندیشہ

[1] کنز العمال جلد ۹ صفحہ ۳۵۳ روایت نمبر ۲۶۴۱۳

ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کی یہ تعلیم بھی ہے کہ مساجد میں کوئی بدبودار شے کھاکر یا ایسی چیز استعمال کر کے نہ آؤ جس کے بعد بدبودار ڈکار آئیں یا مونہہ سے بو آئے (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب النھی اکل الثوم) انہی تعلیمات میں سے ہے جن کی غرض عام بنی نوع انسان پر شفقت ہے کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور مساجد کا نام تو اس لئے لیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اجتماع مساجد میں ہی ہوتا ہے ورنہ یہ حکم عام ہی ہے۔ اور یہ ایسا ضروری حکم ہے کہ آج حکام ریلوے کو یہ قانون بنانا پڑا ہے کہ ریل میں کوئی شخص سگرٹ نہ پئے کیونکہ اس سے سکھوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر اسلام ہی کی تعلیم پر عمل کیا جائے تو ان باتوں کے لئے کسی مزید قانون کی ضرورت نہیں اور جو اثر انسان کے اعمال پر مذہب کر سکتا ہے قانون ہرگز نہیں کر سکتا۔

پھر انہی تعلیمات میں سے ایک یہ تعلیم بھی ہے کہ جب کسی جگہ پر کوئی وباء پڑے تو لوگوں کو اجازت نہیں کہ اس جگہ سے بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلے جائیں (مسلم کتاب السلام باب الطاعون) کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے محفوظ علاقوں میں بھی وہ مرض پھوٹ پڑے گا۔ اس حکم کی خوبی پچھلے دنوں ہندوستان کافی طور پر دیکھ چکا ہے کیونکہ طاعون کی کثرت ہندوستان میں اسی حکم پر عمل نہ ہونے کے باعث ہوئی ہے جب ایک جگہ طاعون پڑی تھی تو وہاں کے لوگ بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلے جاتے تھے اور طاعون کا اثر وہاں بھی ہو جاتا تھا۔ اگر ہندوستان مسلمان ہوتا اور وہ اس حکم پر عمل کرتا تو سمجھ سکتے ہو کہ یہ وباء کس طرح دبی رہتی۔ اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ شہر کو چھوڑ کر باہر ڈیرہ لگانا بھی منع کر دیا گیا ہے کیونکہ سنت صحابہؓ سے یہ بات ثابت ہے کہ طاعون وغیرہ وباؤں کے وقت جنگلوں میں پھیل جانا چاہئے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک وباء زدہ شہر سے نکل کر دوسرے محفوظ علاقوں میں نہیں جانا چاہئے۔

اسی طرح اسلام بنی نوع انسان کی ہمدردی کے لئے یہ حکم بھی دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص عام راستہ پر کوئی ایذاء دینے والی چیز دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے راستہ سے ہٹا کر پرے کر دے۔ مثلاً عین راستہ میں کوئی پتھر پڑا ہے کانٹے دار درخت کی شاخیں پڑی ہیں جن سے چلنے والوں کے گرنے یا زخمی ہونے کا خطرہ ہے تو چاہئے کہ ان کو وہاں سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا جائے۔

(ترمذی ابواب البر و الصلۃ باب ماجاء فی اماطۃ اذی عن الطریق) اور آنحضرت ﷺ نے اس فعل کو صدقات میں شامل فرمایا ہے۔ اور یہ وہ تعلیم ہے جس کی مثال اور کوئی مذہب نہیں پیش کر سکتا۔

جانوروں سے نیک سلوک

اسلام نے جہاں انسانوں پر شفقت کا حکم دیا ہے وہاں جانوروں پر شفقت کی بھی سخت تاکید کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذّٰریٰت : ۲۰) یعنی مسلمان وہ ہوتا ہے کہ اس کے مال میں ان کا جو سوال کر سکتے ہیں یعنی انسانوں کا اور ان کا جو سوال نہیں کر سکتے یعنی جانوروں کا حق ہوتا ہے۔ یعنی مسلمان کا کام ہے کہ وہ اپنے مال میں محتاج انسانوں اور جانوروں کو بھی شریک کرے۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ جانور کو ایذاء دینا سخت منع ہے حتّٰی کہ آنحضرت ﷺ نے ایسے انسان پر جو کسی جانور کو باندھ کر اسے نشانہ بناتا ہے لعنت کی ہے اور یہ آنحضرت ﷺ ہی ہیں جنہوں نے جانوروں کے مونہہ پر نشان لگانا منع کیا کہ مونہہ ایک نازک جگہ ہے اس پر نشان نہ لگایا کرو۔ اور آپؐ نے جانوروں کی پچھلی ران کے اوپر کے سرے پر نشان لگانے کا حکم دیا جو رواج کہ اس وقت عام طور پر دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے ایک بلی کو بند کر دیا اور وہ بھوکی پیاسی مرگئی تو خدا تعالیٰ نے اس کو جہنم میں ڈال دیا (مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب تحریم تعذیب الھرۃ) یعنی اس ظلم کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ ایسے اعمال میں پھنس گئی جن کا نتیجہ جہنم ہُوا۔ غرض جانوروں سے بھی نیک سلوک کرنے کا حکم اور ان پر بے جا ظلم کرنے اور بے فائدہ تکلیف دینے سے اسلام نے روکا ہے اور اس طرح اپنی تعلیم کو ہر رنگ میں کامل کر دیا ہے۔ اور کسی خاص بات پر ہی زور نہیں دیا۔ بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور اس کی ہر ضرورت کے متعلق مناسب اور عدل پر مبنی احکام بتائے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان اس دنیا اور اگلے جہان دونوں جگہ خوش و خرم ہو سکتا ہے۔ پس اسلام ہی ایک مذہب ہے جو تمام دنیا کے لئے قابل عمل ہے اور وہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیم پر ہر ایک طبقہ اور ہر ایک طبیعت کے انسان عمل کر سکتے ہیں۔ اور جس پر عمل کر کے کوئی مفسدہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو ہر زمانہ کے لئے قابل عمل ہے اور اس پر چل کر انسان نجات پا سکتا ہے۔ اور جو خوبیاں تمام مذاہب مختلف طور پر رکھتے ہیں وہ سب کی سب اس میں جمع ہیں اور یہ تمام مفید اور بابرکت تعلیمات کو اپنے اندر

شامل رکھتا ہے۔ اور چونکہ یہ خدا تعالیٰ کا بھیجا ہُوا آخری مذہب ہے جو انسان کو خدا تعالیٰ سے اسی دنیا میں ملا دیتا ہے اور ہمیشہ پھل دیتا ہے چنانچہ اس پر چلنے والے لوگ ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ تک پہنچتے رہے ہیں۔ اور یہ زمانہ بھی اس کے شیریں پھلوں سے خالی نہیں گیا۔ اور خدا تعالیٰ نے اسی مذہب کے ایک پیرو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو اس زمانہ کی اصلاح کے لئے مسیح موعودؑ اور مہدی مسعودؑ بنا کر بھیجا ہے۔

پس اے صداقت کے طالبو! اور حق کے شیدائیو! اٹھو! اور تمام بند توڑ کر اور تمام قیود کو توڑ کر اس چشمۂ صافی کی طرف آؤ کہ تمہاری فطرت جس خوشی اور جس راحت اور جس تسلی کو چاہتی ہے وہ اس وقت صرف اسلام میں ہی ملتی ہے۔ اور اسلام ہی ہے جو تم کو روحانی ترقی کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا سکتا ہے کہ اسی دنیا میں تم خدا کو پا سکتے ہو اور شک و شبہ سے گزر کر یقین کا مرتبہ حاصل کر سکتے ہو۔

خاکسار

محمود احمد از قادیان

۱؎ ایسا ہی فرمایا تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان: ۲)